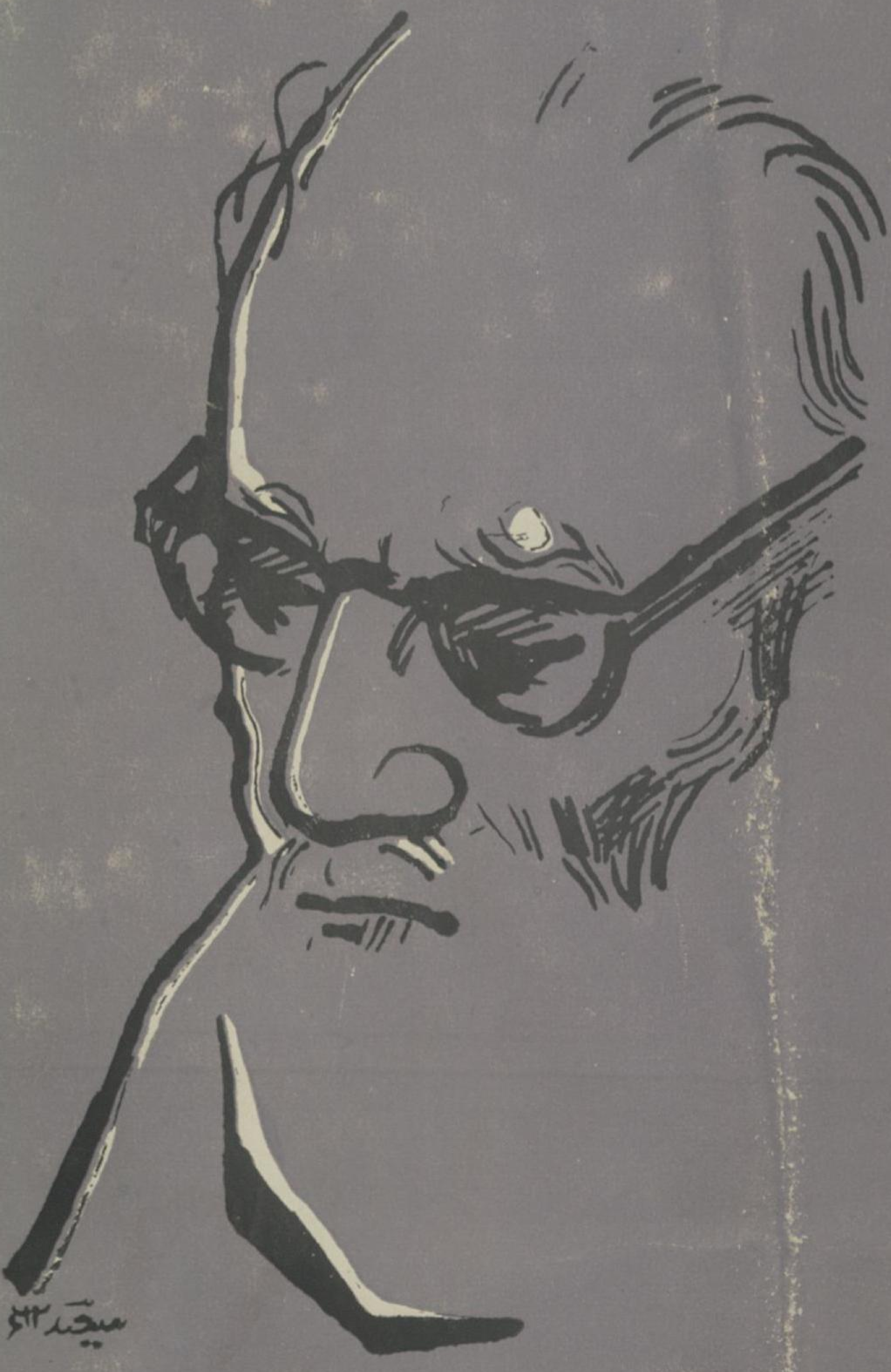
افکارِ عبدالحق



اردو اکیڈمی سندھ کراچی

افکارِ عبدالحق

مُرتّبہ

آمنہ صدّیقی

ایم اے بی ایڈ

اُردو اکیڈمی سِندھ کراچی

پہلی اشاعت .... ۱۶ - اگست ۱۹۶۲ء

تعداد .... ایک ہزار

مطبع .... انجمن پریس کراچی

قیمت .... دس روپیہ
15

فہرست مضامین

دیباچہ — ا

مقدمہ — ۱

ادب و شعر — ٦٥

ادب اور زندگی ٦٧
ادب اور مقصدیت ۷۰
ادب کا ظاہر و باطن ۷۱
ترقی اور اصلاح ادب میں ۷۴
قصۂ جدید و قدیم ادب میں ۷۵
ادب کی رہگذار ۷۷
ذوق ادب ۷۷
ادیب اور آزادی ۷۸
شعر اور زندگی ۷۹
کلام اور سیرت ۸۰
نظم اور نثر ۸۰
شوخی اور ظرافت، ادب میں ۸۱

اسلوب بیان — ۸۳

نئے اسالیب ۸۵
اسلوب کی سادگی ۸۵

خیال اور بیان ۹۳
صنائع بدائع ۹۴
عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ۹۴

تنقید و تحقیق اور دیگر اصناف ادب — ۹۵

تنقید و تحقیق ۹۷
ڈرامہ نگاری ۱۰۲
سوانح نگاری ۱۰۵
عظیم انسانوں کا مطالعہ ۱۰۸
مشاہیر کے حالات اور درس اخلاق ۱۰۹
آپ بیتی ۱۱۱
مکتوب نگاری ۱۱۳
لغت نگاری ۱۱۵
تراجم کی اہمیت ۱۳۲

لسانیات — ۱۳۷

زبان ۱۳۹
زبان کی نشو و نما ۱۴۰
زبان کا مزاج ۱۴۲
زبان، ایک مقدس میراث ۱۴۲
زبان اور زندگی ۱۴۳
زبان اور انسانی ترقی ۱۴۴
زبان کا مذہب ۱۴۴
قومی زبان ۱۴۵
زبان اور قومی تہذیب ۱۴۶

زبان اور قومیت	۱۴۷
زبان اور قومی ترقی	۱۴۸
زبان اور قومی اتحاد	۱۴۹
زبان اور معاشرت	۱۴۹
زبان کی مخالفت	۱۵۰
زبان کی محبت	۱۵۰
عوام کی زبان	۱۵۱
زبان ہندی	۱۵۱
ایک زبان	۱۵۱
زبان دان اور اہل زبان	۱۵۲
کتابی زبان	۱۵۲
زندہ اور مردہ زبان میں فرق	۱۵۲
معیاری زبان	۱۵۳
فاتح قوم کی زبان	۱۵۳
زبان اور شائستگی	۱۵۴
زبان اور زمانہ	۱۵۴
خالص زبان	۱۵۵
زبانوں کا اختلاف	۱۵۶
غیر زبان کا تسلط	۱۵۸
تعلیم اور غیر زبان	۱۵۸
غیر زبانوں کو سیکھنے کا روشن پہلو	۱۵۹
مخلوط زبان	۱۵۹
عورتوں کی زبان	۱۶۲
الفاظ	۱۶۶
الفاظ کی سیرت	۱۶۶

لفظ کا صحیح استعمال ۱۶۷
بدیسی الفاظ ۱۶۸
غیر زبان کے الفاظ کا استعمال ۱۷۰
نئے الفاظ اور خیالات ۱۷۱
لفظ کا معیار ۱۷۲
نئے الفاظ اور اصطلاحات علمیہ ۱۷۲
وضع اصطلاحات ۱۷۲
دخیل الفاظ ۱۷۳
رسم الخط ۱۸۸
رسم الخط کا مسئلہ ۱۹۱

حیات و کائنات - ۱۹۳

مقصد زندگی ۱۹۵
اعمال انسانی ۱۹۵
انسانیت ۱۹۶
انسانیت کی تلاش ۱۹۸
جوہر انسانیت ۱۹۸
انسانیت ۱۹۸
انسانیت کا معیار ۱۹۸
انسان اور دنیا ۱۹۹
سیرت ۱۹۹
اچھائی اور برائی ۲۰۰
انسان اور تقاضائے عصر ۲۰۰
اخلاق ۲۰۱
اخلاق اور تمدن ۲۰۳

تعلیم اور اخلاق ۲۰۵
علم ۲۰۷
جدید تعلیم ۲۰۷
علم اور ذوق صحیح ۲۰۹
وقت کا تقاضا ۲۰۹
انسانی ترقی اور اشاعت علم ۲۰۹
علوم و فنون اور عوام ۲۱۰
قوموں کا عروج و زوال ۲۱۰
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں ۲۱۴
مساوات کا عجیب مفہوم ۲۱۴
بیرونی وسائل اور قومی ترقی ۲۱۵
عظمت کی علامت ۲۱۵
پائیدار عظمت ۲۱۵
اسلاف کی غلطیاں ۲۱۶
کامیابی ۲۱۶
لذت کار ۲۱۶
قومی لباس ۲۱۶
تباہی کے اسباب ۲۱۷
مطالعہ ۲۱۷
بہترین مطالعہ ۲۲۰
شہرت ۲۲۱
عقل اور دولت (۱) ۲۲۱
کہاں ۲۲۲

---

(۱) متن کتاب میں " عقل " کی جگہ " تحمل " چھپ گیا ہے۔
از راہ کرم تصحیح فرما لی جائے۔

اچھی صحبت کا اثر	۲۲۲
امراء کی صحبت	۲۲۳
محبت اور جبر	۲۲۳
حکومت	۲۲۳
روایت پسندی	۲۲۳
نئی روشنی اور روایت پسند	۲۲۴
عمل	۲۲۴
حقیقی مسرت	۲۲۵
غلطی	۲۲۵
کاہلی	۲۲۶
مخالفت	۲۲۶
وقت	۲۲۷
مذہب	۲۲۸
شوق و سعی	۲۲۸
اچھا استاد	۲۲۹
ماضی، حال اور مستقبل	۲۲۹
شادی	۲۲۹
عالی دماغ شخصیتیں	۲۳۰
بڑا آدمی	۲۳۰
بڑے آدمیوں کے وعدے	۲۳۲
تصوف	۲۳۲
صوفی اور مولوی	۲۳۳

مذہب و سائنس - ۲۳۷

دیباچہ

اس کتاب کو بابائے اردو کی زندگی ہی میں شائع ہوجانا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ یہ ایسے موقع پر شائع ہورہی ہے جب کہ انہیں ہم سے جدا ہوئے پورا ایک سال گزر چکا ہے۔

میں نے ۵۹ء کے اواخر میں بابائے اردو کے ادبی کارناموں پر ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ادب و تنقید اور دیگر مسائل کے بارے میں بابائے اردو کے جو خیالات ان کی کتابوں اور مقالوں میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں کیوں نہ ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ بابائے اردو کے نظریات اور ذہنی رجحانات کو سمجھنے میں سہولت ہوجائے۔ تقریباً ایک سال تک میں نے بابائے اردو کی مختلف تحریروں کو کھنگالا اور یہ کتاب مرتب کی، کتاب کے شروع میں میں نے اپنا مذکورہ مضمون بطور مقدمہ شامل کیا اور مسودہ بابائے اردو کی خدمت میں پیش کردیا۔ انہوں نے میری اس کوشش کو بہت سراہا اور یہ کہہ کر مسودہ اپنے پاس رکھ لیا کہ وہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے اس کی طباعت کا انتظام فرما دیں گے۔ مجھے خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ بابا نے میرے کام کو پسند فرمایا، لیکن افسوس کہ

ان کی وفات کی وجہ سے یہ کتاب انجمن کی طرف سے شائع نہ ہوسکی ۔ اب یہ کتاب اردو اکیڈیمی سندھ کی طرف سے شائع کی جارہی ہے جس کے لئے میں جناب علاءالدین خالد کی ممنون ہوں ۔

اس کتاب کو مرتب کرتے ہوئے میں نے بابائے اردو کی تقریباً تمام تحریروں کو پیش نظر رکھا ہے ۔ مستقل تصانیف کے علاوہ رسالہ " اردو " " قومی زبان " اور دیگر رسائل میں شائع ہونے والے مضامین سے بھی استفادہ کیا ہے، البتہ " افسر "، " حسن " " انسٹی ٹیوٹ گزٹ " اور " دکن ریویو "، میں شائع شدہ مضامین تک میری رسائی نہیں ہوسکی ۔ توقع ہے کہ کتاب کی آئندہ اشاعت میں یہ کمی پوری کردی جائے گی ۔ سوائے دو کتابوں کے بابائے اردو کی بقیہ تمام تصانیف کے پہلے ایڈیشنوں کو میں نے سامنے رکھا ہے ۔ "خطبات عبدالحق" کے سن ۵۵ء کے ایڈیشن اور " چند ہم عصر " کے اردو اکیڈیمی سندھ کے شائع کردہ نسخے سے استفادہ کیا گیا ہے ۔

اس کتاب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ادب اور شاعری ، اسلوب بیان ، تنقید و تحقیق اور دیگر اصناف ادب، لسانیات ، حیات و کائنات اور مذہب و سائنس سے متعلق نظریاتی مباحث کو یک جا کردیا گیا ہے ۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ہر حصے سے متعلق اقتباسات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہر حصہ بجائے خود ایک مستقل مقالے کی صورت اختیار کرلے ۔ ہر اقتباس کے ساتھ متعلقہ کتاب یا

مضمون کا حوالہ موجود ہے۔ آخری باب جو مذہب و سائنس سے متعلق ہے، وہ در اصل " مذہب و سائنس " از ڈریپر مترجمہ مولانا ظفر علی خاں کا مقدمہ ہے۔ اس تحریر کو میں نے مکمل طور پر اس کتاب میں اس لئے شامل کیا ہے کہ یہ بابائے اردو کی مفکرانہ صلاحیتوں کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔

زیر نظر کتاب کا مقدمہ چونکہ بابائے اردو کی زندگی میں لکھا گیا تھا، اس لئے اس کے بعض حصوں میں ان کا ذکر اس انداز سے آیا ہے جیسے وہ ہمارے درمیان موجود ہوں۔ میں نے مقدمہ میں کسی قسم کی کوئی ترمیم نہیں کی جس صورت میں یہ بابائے اردو کی نظر سے گذرا تھا اسی صورت میں اسے رہنے دیا ہے۔

آمنہ صدیقی

کراچی

۱۶ - اگست ۶۲ء

مقدمه

زبان کسی ملک یا قوم کا سب سے اہم ثقافتی مظہر ہے۔ یہ انسانی خیالات و جذبات کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں صدیوں کے ان گنت تجربات مفاہیم و معانی کے نئے نئے جلوے دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ انسان کی سماجی تگ و دو اور ثقافتی جدو جہد کی ایک زندہ و متحرک تاریخ ہے۔ اس کے دامن میں وہ سب کچھ ہے جسے انسان نے حاصل کرنے کی تمنا کی، جس کے لیے وہ کوشاں ہوا اور جسے آخر کار اُس نے حاصل کرلیا۔ یہ انتقال مطالب کا ذریعہ ہی نہیں انکشاف مضمرات کا وسیلہ بھی ہے، جس کا ایک کنارا ازل سے اور دوسرا ابد سے ملا ہوا ہے۔ زبان تہذیب کی آئینہ داری ہی نہیں کرتی بلکہ آئینہ تہذیب کو جلا بھی بخشتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی ملک یا قوم کی ترقی کا اندازہ اس کی زبان سے کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ زبان صرف وہی نہیں ہوتی کہ جس میں الفاظ کا ذخیرہ سب سے زیادہ ہو یا جس کے بولنے والے بہت زیادہ ہوں بلکہ اصل ترقی یافتہ زبان وہ ہے کہ جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی سکت رکھتی ہو اور جسے وقت کی صداؤں سے ہم آہنگ ہونے کا سلیقہ آتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہی بات یوں کہی جاسکتی

ہے کہ ترقی یافتہ زبان اسے کہتے ہیں کہ جس میں جہاں معنی کے ہر پہلو کو بے نقاب کرنے کی سکت ہو۔

زبان سماجی جد وجہد کی تاریخ ہوتی ہے۔ الفاظ و معنی کا تعلق ریاضی کے کلیوں کی طرح غیر تغیر پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس میں نشیب و فراز زمانہ سے متاثر ہوتے رہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر زبان کا مقام کوچوں، گلیوں اور بازاروں میں نہیں ہوتا، لسانیات کی تاریخ میں ہوتا ہے۔ اردو ایک ایسی ہی زبان ہے جسے سماجی ضرورتوں نے جنم دیا۔ کوچوں، گلیوں اور بازاروں نے اپنایا اور وقت نے اسے اپنے ساتھ ساتھ چلنے کا سلیقہ سکھایا۔ یہ دنیا کی جدید ترین زبانوں میں سے ایک ہے اور اسے موجودہ شکل و صورت حاصل کیے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس زبان کے بنانے اور سنوارنے میں مختلف تہذیبوں اور قوموں نے حصہ لیا ہے۔ اسے ہم انگریزی، فرانسیسی یا چند ایک دوسری زبانوں کی طرح بہت ترقی یافتہ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسے ترقی یافتہ زبانوں کے زمرے سے علیحدہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کی وسعت کو دیکھنا 'حیرتی جلوہ' بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

اس زبان کی ترویج و اشاعت میں جن لوگوں نے مختلف طریقوں سے حصہ لیا، ان کا تذکرہ اس مختصر سے مضمون میں نہ تو کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ وہ تمام لوگ اردو کے معمار ہیں جنھوں نے اظہار و

بیان کی ضرورتوں کے لئے اس زبان کو اپنایا — ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

کسی زبان کی 'خدمت' کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس زبان کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے، یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ زبان کی نشر و اشاعت اور ترقی کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے اور اس شعور کو عام کیا جائے کہ زبان سے تغافل برتنا خود اپنے مفاد کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کام اُن لوگوں کا ہے جو زبان کی ثقافتی اہمیت سے واقف ہوں اور اُسے ملک و قوم کی ترقی میں ممد و معاون بنانے کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہوں۔ پہلی صورت سے جن لوگوں نے اُردو زبان کی خدمت کی ہے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مگر دوسری صورت سے سامنے آنے والے دو چار ہی ہیں۔ اور ایسے اور بھی کم ہیں جنھوں نے دونوں صورتوں سے زبان کی خدمت کی ہو — کم کیا صرف ایک!

دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں، کسی عہد میں بھی کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی کہ جس نے تمام زندگی اس زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں صرف کردی ہو۔ یہ فخر صرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ اسے عبدالحق جیسا سپاہی میسر ہے۔ جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج اشاعت کے لئے وقف کردیا۔ اس پیر جوان ہمت نے اس مقصد کے لیے کبھی اپنوں کی

جفائیں سہیں اور کبھی غیروں کے ستم ۔ مخالفتوں کے ایسے ایسے خارزاروں میں قدم رکھا کہ جہاں رہ نوردی کی داد ملی بھی تو آبلہ ھائے پا سے، مگر اس جوان ہمت اور عظیم انسان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ھوئی، اور وہ حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر مردانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔ 'عبدالحق' اور اردو مترادف نہیں مرادف الفاظ ھیں۔ آردو کا عبدالحق کے بغیر اور عبدالحق کا اردو کے بغیر تصور کرنا محال ھے۔

مولوی عبدالحق کی شخصیت، بڑی پہلودار ھے۔ انھوں نے آردو زبان و ادب کی خدمت مختلف طریقوں سے کی ۔ کبھی وہ اس زبان کے سپاھی بن کر مخالفت کے مختلف محاذوں پر لڑتے رھے، کبھی وہ اس کے سفیر بن کر گھر گھر اس کا پیغام پہنچاتے رھے، کبھی انھوں نے خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا اور کبھی انشا پردازی کے بل پر ذھنوں کو جلا بخشی ۔ زبان کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قواعد، صرف و نحو اور لغات کی طرف توجہ کی۔ تعلیمی ضروریات کے لیے نصابی کتابیں تیار کیں اور کروائیں۔ قدیم ادبی سرمائے کو گمنامی سے نکال کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ۔ تحقیق و تنقید کی راھوں پر نئے نئے چراغ جلائے ۔ قوم کو زبان سے دل چسپی لینے کا ڈھنگ سکھایا ۔ علم کی عام اشاعت کے وسائل کو وسعت دی ۔ الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک عظیم ثقافتی رھنما کو کرنا چاھئے — وہ یقیناً ایک عظیم ثقافتی رھنما ھیں۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ انجمن ترقی اردو ہے ۔ اگرچہ وہ اس کے بانی نہیں ہیں، لیکن اس انجمن کی بقا اور ترقی انھی کی مرہون منت ہے ۔ اردو زبان کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی ادارے نے کامل پچاس سال تک زبان و ادب کی ترویج کے لیے کام کیا ہو۔ اسی انجمن سے ہند و پاکستان کے بیشتر مشاہیر اہل قلم وابستہ رہے ہیں اور اس طرح اس کو جو مرکزیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایسے پر آشوب زمانے میں جب مخالفوں نے اردو کو ہر طرح سے ختم کرنے کے منصوبے باندھے، انجمن ان کے ارادوں کی تکمیل کے راستے میں اس طرح جمی رہی جیسے ایک چھوٹی سی ندی کے سامنے کوہ ہمالیہ ۔ حریفوں کے ہر وار کو انجمن نے ناکام بنادیا اور یہ انجمن کی ایسی کامیابی ہے جو اردو کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائے گی ۔

انجمن اردو کے دفاع کے لئے ہی سر گرم کار نہیں رہی بلکہ اس زبان کی ترویج واشاعت کے لیے بھی اس نے اہم کارنامے انجام دیے ۔ اس سلسلے میں پہلا کام تو یہ کیا گیا کہ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کرکے ان کی نگرانی میں اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے ۔ اس طرح بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اردو کو پہنچایا گیا کہ جہاں اس سے لوگ بہت کم واقف تھے مثلاً چھوٹا ناگ پور کا علاقہ ایسا ہے کہ سو

میں مشکل سے ایک آدمی بھی اردو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن انجمن کی سرگرمیوں کی وجہ سے اب یہ علاقہ اردو کا ایک اچھا خاصا مرکز ہے۔

کسی زبان کے ترقی یافتہ ہونے کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ اس کا ادبی سرمایہ مقدار و معیار دونوں کے اعتبار سے اعلی درجے کا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مختلف علوم و فنون پر کافی کتابیں ہوں۔ اردو زبان کے ساتھ یہ مشکل تھی کہ اس کے دامن میں سب کچھ تھا، لیکن نظروں سے اوجھل تھا۔ تمام ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں تھا۔ انجمن نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شایع کیا۔ اس طرح بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظر عام پر آئیں اور یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اردو زبان ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح کم مایہ نہیں ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اردو گزشتہ ایک دو صدیوں میں پھلی پھولی۔ لیکن اب یہ تسلیم کیا گیا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں آردو اس مدت سے بہت پہلے مروج ہوچکی تھی۔

انجمن نے آردو زبان کی تہی دامانی کو ختم کرنے کے لیے علمی و فنی کتابوں اور عالمی ادبیات عالیہ کے تراجم کی طرف بھی توجہ کی۔ اس مقصد کو پورا کرنے سے پہلے اس امر کی ضرورت تھی کہ آردو میں اصطلاحات علمی وضع

کی جائیں اور ایک ایسی انگریزی اردو لغت تیار کی جائے جو مترجمین کی مشکلیں آسان کردے۔ انجمن نے یہ دونوں کام نہایت جانفشانی سے انجام دیئے۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو وضع کیا گیا اور ایک ایسی انگریزی اردو لغت تیار کی گئی جو اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے۔ دنیا بھر میں انگریزی اردو کی کوئی دوسری لغت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لغت کی وجہ سے اردو زبان میں مغربی علوم و فنون کا دروازہ کھل گیا۔ مترجمین نے اچھی کتابوں کے ترجمے کیے اور یہ ثابت کر دکھایا کہ جن کتابوں پر دوسری زبانوں کو ناز ہے وہ اردو کے دامن میں بھی ہیں۔

انجمن نے ہر طرح اور ہر انداز سے اردو کی خدمت کی۔ اردو کے لیے اتنا کام کسی ادارے نے نہیں کیا جتنا کہ انجمن نے کیا۔ لیکن ان سب کاموں کے پس پردہ جو شخصیت کار فرما رہی وہ مولوی عبدالحق ہی کی شخصیت تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے تمام وسائل انجمن کی نذر کر دئیے۔ ان کی تمام توانائیاں، ان کا سرمایہ، ان کی راتوں کی نیند ان کی صبحوں کا آرام، غرض ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ان کے سرمایہ کا ایک ایک حبہ انجمن کی نذر ہو گیا۔ انجمن کی رگوں میں ان ہی کا خون جوش مارتا رہا اور آج بھی جبکہ وہ نوے سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں حسب سابق انجمن ہی ان کی تمام دلچسپیوں کا مرکز ہے۔

انجمن ترقی اردو دراصل مولوی عبدالحق ہی کی

کی ذات کا پرتو ھے۔ انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ شخصیتیں ادارے بناتی ھیں نہ کہ ادارے شخصیتوں کو۔ اگر مولوی صاحب انجمن کو اپنے ھاتھ میں نہ لیتے تو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ اس کا یہ شعبہ بھی ختم ہو جاتا اور خدا جانے اردو کو مخالفوں کے کیا کیا ستم سہنے پڑتے۔

مولوی عبدالحق نے اردو کی جو خدمت کی ھے اُس سے اس زبان کو تو بہت فائدے پہنچے ھیں لیکن اس سے خود مولوی صاحب کی ذات کو ایک ایسا نقصان پہنچا کہ جس کا احساس بہت کم لوگوں کو ھے۔ (اور خود مولوی صاحب بھی شاید ان "بہت کم لوگوں" میں شامل نہیں ھیں) بات یہ ھے کہ مولوی صاحب کی اردو دوستی کی شہرت ایسی ہوئی ھے کہ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو نظروں سے اوجھل ھوکر رہ گئے ھیں۔ ایسا اکثر ھوتا ھے کہ کسی شخصیت کا کوئی ایک پہلو اس حد تک نمایاں ھو جاتا ھے کہ باقی پہلو قدرے دب جاتے ھیں۔ لیکن یہ صورت حال ھمیشہ نہیں رھتی۔ باقی پہلوؤں میں اگر کوئی خاص بات ھوتی ھے تو وہ نمایاں ھو کر رھتے ھیں۔ مولوی صاحب کی اردو دوستی نے اُن کے ساتھ کچھ ایسی ھی دشمنی کی ھے اور اس وجہ سے اُن کو ایک مفکر کی حیثیت سے پہچاننے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مولوی صاحب نے زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو

سمجھنے سمجھانے کی جو پر خلوص کوشش کی ہے اُسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ذہنی جولانیاں 'تفلسف محض' کی پرپیچ و خم رہ گزاروں سے وابستہ نہیں رہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ انہیں صاحب فکر تسلیم نہ کیا جائے ۔ مولوی صاحب نے ایک باشعور انسان کی طرح ان تمام حقیقتوں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جنھیں زندگی کی بنیادی حقیقتیں کہا جا سکتا ہے ۔ ان کے مشاہدے، ادراک اور تجربات کا عکس ان کی بعض تحریروں میں اس طرح نمایاں ہے کہ مطالب و مفاہیم کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں ۔ ان کے ہاں کوئی مربوط نظام فکر نہیں ہے کہ کسی مسئلے پر انہوں نے تفصیل سے بحث کی ہو ۔ اس سلسلے میں وہ غالب کے ہم قدم ہیں ۔ وہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیتے ۔ فلسفیوں کی طرح ذرا ذرا سی باریکیوں پر توجہ نہیں کرتے ، بلکہ وہ مسئلے سے متعلق کوئی ایک بنیادی بات اس طرح سے کہ جاتے ہیں کہ جس کو ذہن نشین کرلینے سے مسئلے کی ساری پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں ۔

ان کی ان گنت تحریروں میں بعض ٹکڑے اور جملے ایسے فکر انگیز نظر آتے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر مولوی صاحب ادب کی طرف توجہ نہ کرتے تو وہ یقیناً بہت بڑے فلسفی ہوتے ۔ انہوں نے انسان اور اس کے متعلقات کے بارے میں کہیں کہیں ایسی

باتیں بھی کہی ہیں جو صداقت کے تابندہ چہرے سے تہہ در تہ نقاب اٹھانے میں بڑی معاون ثابت ہوئی ہیں۔

یہاں مولوی صاحب کی تحریروں سے بہت سے فکر انگیز ''نثر پارے،، پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر صرف ایک ایسی تحریر پر اکتفا کی جاتی ہے جس کی وجہ سے مولوی صاحب کی مفکرانہ صلاحیتوں کا اعتراف ہر دور اور ہر زمانے میں کیا جائے گا۔ یہ تحریر ,, معرکۂ مذہب و سائنس ،، کا مقدمہ ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے نہایت مدلل انداز سے سائنس اور مذہب کا جائزہ لیا ہے اور اس مفروضے کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ازلی اور ابدی حریف ہیں۔ مولوی صاحب نے موضوع کے تمام پہلوؤں کا عالمانہ جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ انسانی زندگی کو ارتقا کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچنے کے لیے مذہب اور سائنس دونوں کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش پیچھے ہٹنے کے مترادف ہے۔ مولوی صاحب کے نزدیک سائنس یا مذہب ایک دوسرے کے دشمن نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں اور دونوں کا مقصد انسان کی خوشحالی ہے۔ مولوی صاحب نے مذہب کی فوقیت کو بھی تسلیم کیا ہے کہ انسان کی مادی ضرورتیں خواہ کتنی ہی بڑھ جائیں، اس کی روحانی قدریں پامال نہیں ہو سکتیں اور پھر آخر میں مذہب اسلام کے بارے میں مولوی صاحب نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں اور بتایا ہے کہ انسان کی

ترقی اور نجات کا سیدھا اور صحیح راستہ اسی مذہب کے اصولوں پر عمل کرنے سے نظر آسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بیسویں صدی میں ایسے افراد ان گنت ہیں جو متذکرہ خیالات کو نشانۂ تضحیک بنائیں اور یہ کہیں کہ آج سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ مذہب کو اس کے مقابلے پر لانا رجعت پسندی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اس بیسویں صدی میں جبکہ انسان کی مادی ترقی اپنے شباب پر ہے، روحانی قدروں کی افادیت بڑھتی چلی جا رہی ہے اور سائنسی دنیا کے بہترین دماغ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ روحانی قدروں کے بغیر مادی ترقی، ترقی معکوس کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس مقدمہ میں الفاظ کے طوطا مینا نہیں آڑائے گئے، بلکہ بحر معانی میں غواصی کر کے ایسے ایسے گوہر ہائے نایاب کا سراغ لگایا گیا ہے جن سے مولوی صاحب کی ذہنی بلندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذہب و سائنس کا موازنہ ایک بہت ہی مبتذل موضوع ہے۔ عام طالب علموں سے لے کر ڈریپر جیسے عالم تک، سبھی نے اس مصرع طرح پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس زمانے میں یہ مقدمہ لکھا گیا تھا، اس وقت تک اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ کوئی نئی بات پیدا کرنا مشکل تھی۔ لیکن مولوی صاحب نے اس مبتذل موضوع کو اپنے نادر اسلوب اور گہری فکر سے ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کردیا۔ انھوں نے انسانی فطرت اور اس کے متعلقات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور کسی پہلو

کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ جذبہ، عقل، ادراک، قوت، مادہ روح، جنس، تمدن، سیاست، ایمان، عقائد، نیچر، علم، محبت، تجربہ، یقین، صداقت اور دوسرے بہت سے بنیادی مسائل پر عالمانہ بحث کی ہے۔ یہ مقدمہ مولوی صاحب کی مفکرانہ صلاحیتوں کا ایک دل کش آئینہ ہے۔ جب تک اردو زبان موجود ہے یہ آئینہ کبھی دھندلا نہیں پڑ سکتا۔

ایک مفکر کی حیثیت سے مولوی صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ ادب اور زبان کے مسائل میں بھی ان کی فکری توانائیاں مضمحل نہیں ہوتیں۔ ادب، تنقید، زبان اور معنویات (Semantics) وغیرہ کے بعض بنیادی مسائل پر انھوں نے جو نظریاتی بحثیں چھیڑی ہیں وہ اردو ادب کا خاصہ ہیں۔ افسوس کہ ان موضوعات پر مولوی صاحب کی کوئی مستقل تصنیف موجود نہیں ہے، تاہم وہ اشارے جو ضمنی طور پر ان کی تحریروں میں بکثرت نظر آتے ہیں، ان کے فکر و تدبر کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

تقریظ، دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ — یہ سب الفاظ بڑی حد تک مترادف ہیں۔ ممکن ہے ازروئے لغت ان میں بہت فرق ہو لیکن ازروئے استعمال تو یہ ایک ہی طرح کے سانچے ہیں، جن میں چند پیش پا افتادہ باتوں — مصنف کی تعریف اور کتاب کی تعریف — کو ڈھال کر کسی بھی کتاب کی ضخامت بڑھائی جا سکتی ہے۔ یہ رسم ہمارے ادب میں ایک عرصے سے چلی آرہی ہے کہ اکثر مصنفین اپنی

کتابوں کا آغاز ,,مستند حضرات،، کے کلمات تحسین سے کرتے ہیں - اور پھر ان کلمات کے عنوان کے لیے متذکرہ بالا الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ منتخب کر لیتے ہیں - اُردو کتابوں کے بیشتر دیباچے، مقدمے یا پیش لفظ دیکھ جائیے - سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں - شاید اس کا سبب یہ ہے کہ مصنفین کو نہ صرف قارئین پر بلکہ خود اپنی ذات پر بھی اعتماد نہیں ہوتا - اس لیے وہ اس بے اعتمادی کی فضا کو ختم کرنے کے لیے ایسی اسناد فراہم کرتے ہیں جن میں کتاب اور مصنف دونوں کو ہی لاثانی قرار دیا گیا ہو - یہ روایت صحت مند ادبی فضا کے لیے سخت مضر ہے - یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور آئے دن ایسی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں جن میں ایک دو دیباچے نہیں، بلکہ بیس بیس پچیس پچیس 'اسناد' ہوتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دیباچوں (اور اب تو اس قسم کی تحریروں کے لیے اور بھی کئی نئے نئے عنوان وضع کر لیے گئے ہیں مثلاً سخنہائے گفتنی، حرفے چند، حرف اول، پیش رس وغیرہ وغیرہ) کی ضخامت اصل کتاب سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے -

غالب پہلا شخص ہے جس نے اس روش سے انحراف کیا - اگرچہ اُس نے بعض راویتی انداز کی تقریظیں ضرور لکھی ہیں لیکن 'آئین اکبری' کو جب سر سید احمد خان نے مدون کیا تو اس کے لیے غالب نے جو تقریظ لکھی اس میں اس نے کچھ 'صاف صاف باتیں' کہہ دیں' جو سر سید کو اس حد تک ناگوار گزریں کہ انھوں نے اس

تقریظ کو شامل کتاب ہی نہ کیا ۔ غالب کی یہ 'بت شکنی' شاید پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھی گئی اور اسی لیے پھر کسی نے ایسی جرات بھی نہ کی۔

کسی کتاب پر مقدمہ یا دیباچہ لکھنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ قابل اعتراض بات تو یہ ہے کہ اس مقدمے یا دیباچے کو مصنف یا کتاب کا اشتہار بنادیا جاتا ہے۔ مقدمہ نگار اگر متعلقہ کتاب کے موضوع پر خود اپنے خیالات پیش کرے یا بعض ایسے امور کی طرف توجہ دلائے جن تک مصنف کی نظر نہیں گئی تو یقیناً اس کا مقدمہ کام کی چیز بن سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی مقدمہ نگاری اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ انھوں نے اپنے مقدموں کو قصیدہ گوئی یا مناقب خوانی کی کھتونی نہیں بنایا ۔ ان کے مقدمات کی علمی و ادبی حیثیت بعض اوقات اصل کتاب سے بڑھ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحقیقی و تنقیدی سرمائے میں ان کے مقدمے ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی ابتداء سے ہوتا ہے ۔ ان کا پہلا مقدمہ شاید 'جنگ روس و جاپان' پر تھا، جو ۱۹۰۵ء میں شایع ہوئی تھی۔ ان کا آخری مقدمہ 'جدید اردو لغات' پر ہے، جو رسالہ 'اردو' (جنوری، اپریل ۱۹۵۹ء) میں شایع ہوا ہے۔ گویا مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کی داستان پورے ساٹھ برسوں کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران میں انھوں نے تقریباً

پچاس (۱) مقدمے لکھے ۔ یہ مقدمات اپنے موضوعات کے اعتبار سے گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں ۔ ان مقدموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کتاب مصنف اور موضوع کے بارے میں صرف وہی باتیں کہتے ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں ۔

مولوی صاحب نے ہر طرح کی کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں ۔ ادب، تاریخ، سائنس، فلسفہ، مذہب، غرض ہر موضوع کی کتابوں پر ان کے مقدمے موجود ہیں ۔ زیادہ تر مقدمے اردو کی قدیم کتابوں پر ہیں جو انھوں نے مرتب کیں مثلاً اردو شاعروں کے بعض اہم تذکروں 'نکات الشعراء'، گلشن ہند، چمنستان شعراء'، گل عجائب، 'مخزن شعراء'، وغیرہ اور قدیم ادب کی بعض نادر کتابوں مثلاً ,سب رس، ,معراج العاشقین، 'باغ و بہار، 'مثنوی خواب و خیال، اور 'دریائے لطافت، وغیرہ پر انھوں نے جو مقدمے لکھے وہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ اس قسم کے مقدموں میں مولوی صاحب کتاب کی اہمیت پر خاص طور زور دیتے ہیں، اس کے ادبی و علمی معیار کو جانچتے ہیں، اسی نوع کی دوسری کتابوں سے اس کا موازنہ کرتے ہیں، خوبیوں اور خامیوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، مصنف کے حالات زندگی پر بھی وہ

(۱) مولوی صاحب کے مقدمات کا مجموعہ دو جلدوں میں حیدرآباد (دکن) سے ۱۹۳۱ء میں شایع ہوا تھا ۔ اس میں تمام مقدمات شامل نہیں ہیں ۔

خاص توجہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ بڑی تحقیق سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'چمنستان شعراء' (از لچھمی نرائن شفیق) کا مقدمہ ملاحظہ کیجئے۔ اس میں ابتداً مصنف کے حالات زندگی ہیں، پھر اس کی تصنیفات کا تذکرہ ہے، اس کی تذکرہ نگاری کی خصوصیات پر بحث ہے (اسی میں چمنستان شعرا کا جائزہ بھی شامل ہے) اور پھر اس کے کلام کی خصوصیات اجاگر کی ہیں۔ گویا 'چمنستان شعرا' کا یہ مقدمہ شفیق کی زندگی اور اس کے کارناموں کا ایک محققانہ جائزہ ہے۔ اسی طرح 'باغ و بہار' اور 'سب رس' کے مقدموں میں انھوں نے وجہی اور میر امن کے حالات، ان کی کتابوں کے مآخذ و مماثلات اور ان کی زبان پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار سامنے آتا ہے۔

مولوی صاحب کے مقدمات کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جس کی افادیت اپنی مثال آپ ہے، یعنی وہ اپنے بعض مقدموں میں موضوع کتاب کی پوری تاریخ بیان کرجاتے ہیں اور یہ تاریخ قاری کو اصل کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو مقدمے بڑے معرکے کے ہیں، ایک 'قواعد اردو' کا اور دوسرا 'جدید اردو لغات' کا۔ پہلے مقدمے میں انھوں نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ اردو زبان کی قواعد کی کتابیں کس زمانے سے لکھی جارہی ہیں اور پھر ہر کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں بیش بہا

معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح 'جدید اردو لغات' کے مقدمے میں تمام لغات کا تاریخی جائزہ لیا ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی ہے۔ یہ دونوں مقدمے بجائے خود مستقل تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادبی کتابوں پر جو مقدمے مولوی صاحب نے لکھے ہیں ان میں سے بعض نقد عالیہ کی حیثیت اختیار کرچکے ہیں۔ مثلاً ''انتخاب کلام میر''، ''مسدس حالی''، ''خطوط شبلی'' اور ''اردو تنقید کا ارتقاء'' کے مقدمے ــ کہا جاتا ہے کہ مولوی صاحب کا سب سے اچھا مقدمہ ''انتخاب کلام میر'' پر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مقدمہ میر سے متعلق بڑی بڑی کتابوں پر بھی بھاری ہے۔ اس میں میر کے حالات زندگی بڑی تحقیق کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور اس کا اہم ترین حصہ وہ ہے جو میر کے شاعرانہ کمالات پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ عملی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ 'مسدس حالی' پر مولوی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں مولانا حالی کے عہد کے سیاسی اور سماجی محرکات، ان کے شاعرانہ محاسن اور مسدس کا تجزیہ بڑے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ''اردو تنقید کا ارتقا'' (از ڈاکٹر عبادت بریلوی) پر جو مقدمہ ہے، وہ اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ مولوی صاحب نے پہلی بار اس میں فن تنقید کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اور اس فن کی تعریف نہایت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں

کہ چند صفحے کا یہ مقدمہ، اصل کتاب سے (جو پانچ سو صفحات سے زائد پر مشتمل ہے) زیادہ مفید ہے۔

سوانحی اور تاریخی کتابوں پر مولوی صاحب نے جو مقدمات لکھے ہیں ان میں 'حیات النذیر'۔ 'مشاہیر یونان وروما'، تمدن ہند، 'مآثرالکرام' اور 'ناقابل فراموش' کے مقدمے ہر اعتبار سے نا قابل فراموش ہیں۔ حیات‌النذیر' کا مقدمہ دل چسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ دل چسپ اس لحاظ سے کہ اس میں دو ایک جگہ بعض لوگوں پر بہت ہی دل کش پیرائے میں طنز کیا ہے۔ فکر انگیز یوں ہے کہ اس میں فن سوانح نگاری کے بارے میں بعض بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شبلی کے دیباچۂ 'الفاروق' کے بعد اردو زبان میں یہ دوسری تحریر ہے کہ جس میں فن سوانح نگاری کی حدود سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمۂ 'مشاہیرِ یونان و روما' کے ابتدائی چند صفحات مطالعے یا پڑھنے کی عادت کے بارے میں ہیں۔ مولوی صاحب نے ان چند ہی صفحوں میں بڑی خوش اسلوبی سے ملٹن کے اس قول کی تفصیل پیش کی ہے۔ 'عمدہ کتاب حیات ہی نہیں، بلکہ ایک لافانی چیز ہے'۔ 'تمدن عرب' کا مقدمہ دوحصوں میں ہے۔ پہلے حصے میں اس کے مترجم مولوی سید علی بلگرامی کے حالات زندگی بیان کیے ہیں اور دوسرے حصے میں تمدن ہند پر بحث کی گئی ہے۔ اس مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مطالعہ صرف ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ سماجی اور سیاسی علوم سے بھی پوری طرح واقف ہیں

قوموں کے عروج و زوال اور مختلف تہذیبوں پر بھی ان کی نظر بہت گہری ہے۔

سائنس اور مذہب سے متعلق جن کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں، وہ یہ ہیں۔ ''اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام''۔ ''تحقیق الجہاد''، ''معرکۂ مذہب و سائنس'' اور ''پراسرار کائنات''۔ ان مقدمات سے مولوی صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ ''اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام''، مولوی چراغ علی کی کتاب ہے، جس کا ترجمہ خود مقدمہ نگار نے کیا تھا۔ اس مقدمے کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے میں مصنف کے حالات زندگی قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں اور دوسرے میں موضوع کتاب سے بحث کی ہے۔ مولوی صاحب نے اس حصے میں کتاب کا تعارف اس انداز سے کروایا ہے کہ مصنف کا مافی الضمیر بڑی خوبی سے واضح ہو جاتا ہے۔ ضمنی طور پر بعض مذہبی اور معاشرتی مسائل پر بھی بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ ''پراسرار کائنات'' کا مقدمہ اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں مولوی صاحب نے ترجموں کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔

''معرکۂ مذہب و سائنس'' مولوی صاحب کا طویل ترین مقدمہ ہے۔ یہ تقریباً ایک سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ بجائے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے آردو میں یہ ایک بالکل نئی چیز

ہے اور مولوی صاحب کو ایک مفکر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس مقدمے میں غور و فکر کی وہ تمام بلندیاں ملتی ہیں جو کسی بھی تصنیف کو حیات دوام بخش سکتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ مولوی صاحب کا بہترین مقدمہ ہے (اس مقدمہ پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔)

مولوی صاحب کے مقدمے علم و ادب کی بعض ایسی راہوں سے متعارف کرواتے ہیں کہ جہاں سے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ ان کی تحقیق بعض ایسے حقائق کو بے نقاب کرتی ہے کہ جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کی تنقید ادب پاروں کی قدر و قیمت کچھ اس طرح متعین کرتی ہے کہ ان کی دیانت داری پر ان کا بڑے سے بڑا حریف بھی شک نہیں کر سکتا۔ ان مقدمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور علم کا کوئی شعبہ ان کی دسترس سے باہر نہیں۔

خیالات کے اظہار کے لیے خطابت کو ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا ہے۔ یہاں تک کہ بعض مفکرین نے اس کا شمار فنون لطیفہ میں کیا ہے۔ اچھی خطابت بعض اوقات شاعری اور ڈرامے سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خطیب اپنے سامعین کو محض الفاظ و معانی سے ہی نہیں متاثر کرتا، بلکہ اُس کی آواز کا آتار چڑھاؤ، اُس کے چشم و ابرو کی حرکات، لب و لہجہ کی موزونیت اور

اُس کے ہاتھوں کے اشارے وغیرہ بھی سامعین کو متاثر کرنے میں بڑا حصہ لیتے ہیں۔ الفاظ کے معانی ہر حال اور عالم میں وہی نہیں ہوتے جو لغات میں بیان کیے جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات — بعض اوقات کیا اکثر اوقات — بولنے والے کا انداز بیان معانی میں بہت کچھ ردو بدل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً ''کہی ہوئی،، باتوں سے ''ان کہی،، باتیں زیادہ بامعنی ہوتی ہیں۔ خطیب کی کامیابی اس میں نہیں کہ وہ سامعین کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے بلکہ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ خود سامعین کی توجہ کا مرکز بنا رہے۔ اور یہ اُسی وقت ہوتا ہے جب کہنے والا سننے والوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو— مولوی صاحب اس راز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں نے اُن کی دو یا تین تقریریں سنی ہیں۔ جن کی یاد آج بھی میرے لیے ''فردوس گوش،، ہے۔ ان کی آواز کا اُتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ کی شگفتگی سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے— وہ کسی موقع پر سامعین کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ تقریر کر رہے ہیں گفتگو کا سادہ مگر پرکار انداز ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص یہی تصور کرتا ہے کہ وہ صرف اُسی سے مخاطب ہیں۔ مولوی صاحب کے خطبات و تقاریر دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو فی البدیہہ کی گئیں اور دوسری وہ جو پہلے سے لکھ کر پڑھی گئیں۔ پہلی طرح کے خطبوں کا افسوس ہے کہ کوئی ریکارڈ میرے سامنے نہیں۔ دوسری طرح کے خطبے

کتابی شکل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اور یہاں اُن ہی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

مولوی صاحب کے خطبات کی حیثیت مستقل مضامین کی سی ہے، کیونکہ یہ نہایت محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ ہر خطبہ ایک مخصوص انفرادیت کا حامل ہے اور اپنی جگہ ایک مستقل تصنیف ہے۔ یہ خطبات ایک ہی مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں۔ اور وہ مرکزی خیال ''اردو'' ہے۔ ان خطبوں میں اردو زبان کی تاریخ' اس کے لسانی ارتقا' اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ علمی و ادبی اداروں کی کاوشوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کے لسانی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ادب و زبان کے بنیادی مسائل کو سلجھانے کی پر خلوص کوشش کی گئی ہے۔ اردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت کے لیے قابل عمل تجویزیں بتائی گئی ہیں۔ اردو زبان سے متعلق شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر مولوی صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ گویا یہ خطبات اردو زبان کا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔

ان خطبات کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ ان میں زبان خصوصاً اردو زبان سے متعلق لسانی مسائل کو چھیڑا گیا ہے' اور بہت سے متنازعہ فیہ مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھایا گیا ہے۔ زبان کیا ہے؟ — قومی زبان کسے کہتے ہیں؟ — لفظ کیا ہے؟ - لفظ و معانی کا باہمی ربط کیونکر قائم ہوتا

ہے؟ — مخلوط زبان کیا ہے؟ — اردو مخلوط زبان کیوں ہے؟ — اردو کا خمیر کن عناصر سے مرکب ہے؟ — اردو میں ہندی فارسی اور عربی عناصر کس حد تک ہیں؟ — اردو میں نظم و نثر کا رواج کب ہوا؟ — اردو نے ہندوستان کے کن کن مقامات پر پرورش پائی؟ — کن کن لوگوں اور اداروں نے اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا؟ — مختلف ادوار میں اس کی صورت کیا تھی؟ — مقامی تعصب زبان کی ترقی کی راہ میں کس حد تک حارج ہوتا ہے؟ — زبان کی صحت کا معیار کیا ہے؟ — اردو میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ کس طرح حل کرنا چاہیئے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے سوالوں کے تشفی بخش جوابات ان خطبوں میں ملتے ہیں۔ مولوی صاحب نے لسانی مسائل پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی۔ لیکن ان خطبات کی وجہ سے ان کا شمار صف اول کے ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے لسانی مسائل کو حل کرنے میں جو داد تحقیق دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مثال کے طور پر بہار اردو کانفرنس کا خطبۂ صدارت دیکھیئے۔ اس میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی لکھا ہے کہ مختلف ادوار میں اردو کو کن کن ناموں سے موسوم کیا گیا۔ اس موضوع پر انہوں نے بہ مشکل تین صفحے لکھے ہیں۔ لیکن ان تین صفحوں میں ہی انہوں نے پوری ایک داستان بیان کردی ہے جو تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

برصغیر ہند و پاکستان کی ثقافتی تاریخ میں وہ لسانی

جھگڑا بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے ہندی اردو جھگڑے کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ جھگڑا آج سے تقریباً اسی نوے سال قبل شروع ہوا جبکہ اردو کی عام مقبولیت کو نظر انداز کر کے ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان منوانے کی کوشش کی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کی تشکیل و تعمیر اور بنانے سنوارنے میں ہندوستان کی تمام قومیں برابر کی شریک ہیں لیکن یہ زبان نہ تو کسی ایک خطے کی ملکیت ہے اور نہ کسی ایک قوم کی میراث ہے۔ اس پر سبھی کا حق ہے۔ لیکن جب بعض لوگوں نے اپنا فساد اردو کی مخالفت ہی میں دیکھا تو انہوں نے ہندی کا ڈھونگ رچایا۔ ہندی بقول ڈاکٹر مسعود حسین ایک منفی لسانی تحریک ہے اور کوئی فطری زبان نہیں۔ ایک عرصہ تک ہندی اردو کا جھگڑا دبی ہوئی آگ کی طرح سلگتا رہا۔ ۱۹۳۵ء و ۱۹۳۶ء میں بعض ''بزرگوں،، نے سیاست اور لسانیات کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی ''مسیحا نفسی،، سے یہ دبی ہوئی آگ شعلہ' جوالہ بن گئی' سارا ملک دو گروہوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف اردو کے حامی اور دوسری طرف ہندی کے طرف دار پیدا ہوگئے۔ ہندی کے طرفدار زیادہ طاقتور تھے کیوں کہ گاندھی جی جیسی بڑی شخصیت اُن کی رہنمائی کر رہی تھی ایسے موقع پر مولوی عبدالحق نے اردو کے تحفظ پر کمر باندھی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو ہی ہندوستان کی مقبول ترین زبان ہے۔ ہندی اردو کے اس جھگڑے کی تمام تفصیلات اور

اردو پر جو اعتراضات کیے گئے ان کے مدلل جوابات "خطبات عبدالحق" میں موجود ہیں اور اس لحاظ سے خطبات کو ہندوستان کے اہم ترین لسانی جھگڑے کی مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

ان خطبات میں مولوی صاحب نے ملک کے تعلیمی مسائل پر بھی جا بجا بحث کی ہے۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستانیوں کی تعلیم خود اُن ہی کی زبان میں ہونی چاہئیے۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے جہاں ایک طرف یہ بتایا ہے کہ غیر زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کے کیا نقصانات ہوتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف یہ بھی مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اردو ہر اعتبار سے اس لائق ہے کہ اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دھلی کالج اور جامعۂ عثمانیہ کی مثالیں جا بجا دی ہیں اور ان عظیم الشان اداروں کی خدمات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں انگریزی راج کے استحکام کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر ان کی قومی اور تہذیبی خصوصیات کو ختم کردیا۔ مولوی صاحب کے نزدیک ہندوستانیوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرانے کی سب سے موزوں تدبیر یہی تھی کہ انہیں خود اُن ہی کی زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ جو کچھ کرسکتے تھے انہوں نے کیا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ ان ہی کی اس خواہش کا نتیجہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر مولوی صاحب

کوشش نہ کرتے تو جامعہ عثمانیہ کبھی وجود میں نہ آتی۔ اس یونیورسٹی کی تعمیر و تشکیل مولوی صاحب کا ایسا کارنامہ ہے کہ جس نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ایک تغیر عظیم برپا کردیا اور ہر شخص کو یہ ماننا پڑا کہ اردو میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے رائج ہو سکے۔ مولوی صاحب کے ان خیالات کی جھلک ان کے خطبات میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

ان خطبات میں مولوی صاحب کی اردو دوست شخصیت پوری طرح بے نقاب نظر آتی ہے۔ مجھے تو ان خطبوں میں وہی سچائی اور وہی خلوص نظر آتا ہے۔ جو ایک اچھی خود نوشت سوانح عمری کا خاصہ ہے۔ مولوی صاحب نے جن مختلف زاویوں سے اردو کی فضلیت ثابت کی ہے، جن مختلف طریقوں سے اردو کے مخالفوں کو شکست دی ہے اس کی تمام روداد ان خطبوں میں مل جائے گی۔ اور یہ روداد ایسی ہی ہے جیسے کوئی اپنی داستان لکھ رہا ہو۔ اگرچہ لفظ ”میں“ ان خطبوں میں بہت کم آیا ہے، اس کے باوجود مجھے اصرار ہے کہ یہ خطبات مولوی صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہی نہیں بلکہ ان کے ”اعترافات“ Confessions ہیں۔ انہوں نے اپنی ذات کو اردو میں ضم کر کے ”من وتو“ کا فرق مٹا دیا ہے۔

انسان کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ خود انسان ہے۔ کسی ایک انسان کی سیرت کو بے نقاب

دیکھ لینا، بہت سی کتابیں پڑھ لینے سے کہیں زیادہ مفید ہے کیوں کہ کتابیں محض علم میں اضافہ کرتی ہیں اور سیرتیں انسانی تجربات و مشاہدات میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ علم بغیر تجربے اور مشاہدے کے جہالت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انسان کی دلچسپی کی سب سے بڑی چیز خود انسان ہے۔ اسے دوسروں کی شخصیتوں کو بے نقاب دیکھنا اس حد تک پسند ہے کہ وہ بعض اوقات خود اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ دنیا کے ادبیات میں فن سوانح نگاری کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔ سوانح نگاری کی بہت سی صورتیں ہیں۔ انہی میں سے ایک "شخصی خاکہ" ہے۔ یہ در اصل مضمون نگاری کی ایک قسم ہے جس میں کسی شخصیت کے اُن نقوش کو اجاگر کیا جاتا ہے جن کے امتزاج سے کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ شخصی خاکہ کسی فرد کی مکمل داستان حیات نہیں ہوتا، بلکہ فرد کی نمایاں خصوصیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں تفصیل سے زیادہ اجمال اور توضیح سے زیادہ ابہام ہوتا ہے اور ایسے اشارے کئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والا موضوع کے ہر پہلو سے واقف ہوجاتا ہے۔

شخصیت کی تصویر کشی کرنا بڑا مشکل فن ہے۔ کوئی شخصی خاکہ اس وقت تک کامیاب کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا کہ جب تک اس میں موضوع کی تصویر اپنے اصلی رنگ روپ میں نظر نہ آئے۔ موضوع کی خوبیوں یا خامیوں کی پردہ داری کی کوشش خود مصنف

کی نا اہلیت کی پردہ در بن جاتی ہے۔ اچھا خاکہ وہی ہوتا ہے جس میں موضوع کو اسی رنگ میں پیش کیا جائے جو اس کا خاصہ ہے۔ اسے صرف فرشتہ یا صرف شیطان بنا کر پیش نہ کیا جائے۔ اسے ان دونوں کا مجموعہ ہی رہنے دیا جائے کیوں کہ اسی مجموعے کا نام "انسان" ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوئے ہیں، جو صرف اچھے یا صرف برے ہوں۔ اچھائی اور برائی دونوں اضافی قدریں ہیں۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ان کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے مصنف کو خاکہ نویسی کرتے وقت اپنے اچھائی اور برائی کے معیار کو سامنے نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اصل حقیقت کو پیش کرنا چاہئے۔ خاکہ نویس کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے اور مصور کے موقلم سے لکھنے کا فن آنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو اس کی تحریر موضوع کے مزار کا کتبہ تو بن سکتی ہے، لیکن اس کی زندگی کا آئینہ نہیں۔

اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصی خاکہ نویسی کے لئے کس قسم کی شخصیتوں کا انتخاب کرنا چاہئے۔ یہ سوال اس وقت بے کار نظر آتا ہے جب یہ حقیقت فاش ہوجائے کہ ہر انسان بجائے خود ایک وسیع دنیا ہے۔ اس میں اچھے، برے، توانا، اپاہج اور امیر و غریب کی کوئی قید نہیں۔ یہ چیزیں شخصیت کو بناتی ہیں نہ بگاڑتی ہیں اور نہ بنیادی طور پر ان خوبیوں کا یا خامیوں کا اثر انسان کی "انسانیت" پر پڑتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال

ہے کہ صرف انہی لوگوں کی زندگی کے حالات قلم بند کرنا چاہئیں جنہوں نے کوئی بڑا کام کیا ہو اور شہرت و ناموری حاصل کی ہو۔ یہ خیال "شہرت و ناموری" کی حد تک رسوا ہو چکا ہے، اس لئے کہ وہ لوگ جنہوں نے کبھی کوئی بڑا کام نہیں کیا اور کبھی شہرت و ناموری حاصل نہیں کی ان کی زندگی کے حالات بھی دوسرے انسانوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں اور اس کی مثالیں دنیا کے ہر ادب میں ملتی ہیں۔

اردو زبان میں شخصی خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے ہاں کچھ اشارے ملتے ہیں لیکن وہ خاکہ نگاری کے ضمن میں نہیں آتے۔ اس قسم کی سب سے پہلی مثال "آب حیات" میں ملتی ہے۔ مولانا آزاد نے بڑی چابک دستی سے ایسی تصویریں بنائی ہیں کہ جو اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض جگہ انہوں نے مبالغے سے کام لیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ یہی مبالغہ بعض اوقات موضوع کے بارے میں بہت سی ناگفتنی باتیں کہ گیا ہے۔ آزاد نے ذوق کا جو تذکرہ لکھا ہے، وہ اردو خاکہ نویسی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزاد کی تصانیف کے علاوہ بعض اور مصنفوں کی کتابوں میں بھی ضمنی طور پر شخصیت نگاری پائی جاتی ہے لیکن اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس صنف کو اردو میں صحیح طور

پر متعارف کرانے کا سہرا مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے مختلف لوگوں کے حالات مضامین کی صورت میں لکھنے شروع کر دیے تھے۔ جب ان مضامین کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی تو انہیں کتابی شکل میں ''چند ہم عصر،، کے نام سے یک جا کردیا گیا۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔

مولوی صاحب نے صرف ان لوگوں کی سیرت پر قلم اٹھایا ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہیں۔ جس شخصیت کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ اس قدر مکمل ہے کہ اس میں کسی کمی بیشی کی مطلق گنجائش نہیں۔ موضوع کی تصویر بڑی وضاحت کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آتی ہے۔ بعض لوگوں (مثلاً سر سید اور حالی) کے حالات لکھتے ہوئے اگرچہ عقیدت مندی کا اظہار بھی جا بجا ہوتا ہے لیکن کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولوی صاحب کی عقیدت موضوع کی تصویر کشی میں حائل ہو رہی ہے۔

یہاں یہ توضیح کردینا ضروری ہے کہ ''چند ہم عصر،، میں بعض ایسے مضامین بھی شامل ہیں، جو مرتب (شیخ چاند مرحوم) نے محض اس بناء پر شامل کرلیے کہ ان میں بعض شخصیتوں کا ذکر ہے۔ ایسے مضامین ''شخصی خاکے،، نہیں ہیں۔ (مثلاً حکیم امتیازالدین اور مولانا گرامی وغیرہ کے متعلق تحریریں) اس لیے یہ ہماری بحث کا موضوع نہیں

ہوسکتے۔ ہمارے پیش نظر وہی مضامین ہیں، جن میں مولوی صاحب نے موضوع کی شخصیت کو پوری طرح سامنے رکھ کر قلم اٹھایا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت نگاری کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایسے ہی لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جن کی زندگی کسی نہ کسی اعتبار سے قابل تقلید ہوسکتی ہے۔ مگر انہوں نے ان خاکوں سے اخلاق درس دینے کا کام نہیں لیا کیوں کہ یہ خصوصیت کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان کے موضوعات میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ سرسید اور حالی جیسے بڑے ادیب بھی ہیں، عمادالملک اور محسن الملک جیسے مدبر بھی، حسرت موہانی اور وحید الدین سلیم جیسے شاعر و سخن فہم بھی اور نام دیو مالی اور نور خاں جیسے عام انسان بھی۔ مولوی صاحب نے اپنے موضوع کے انتخاب کا معیار انسانیت کو قرار دیا ہے، نہ کہ دنیاوی شہرت کو۔

مولوی صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیدا کرنے کا فن خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے شخصی خاکے مختصر ہیں۔ لیکن اس اختصار کے ساتھ ساتھ جامعیت بھی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سر سید کے متعلق انہوں نے تقریباً ایک سو صفحات لکھے ہیں لیکن ان کی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے یہ صفحات آٹھ سو صفحے کی "حیات جاوید" سے کسی طرح کم نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "حیات جاوید"

اُردو کی بہترین سوانح عمری ہے اور اُس کا مقابلہ مولوی صاحب کے مضمون سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ کہنا نا مناسب نہ ہوگا کہ اس مضمون میں بعض ایسی معلومات ہیں جو ''حیات جاوید'' میں نہیں۔ اس اعتبار سے اسے حیات جاوید کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب موضوع کی صرف اچھائیوں ہی سے سروکار نہیں رکھتے بلکہ برائیاں بھی بیان کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ''دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح انسان نہ بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا'' (چند ہم عصر ص ۹)۔ سید محمود سے جو اُنہیں تعلق خاطر تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مولوی صاحب اُن کی شراب نوشی کی عادت پر پردہ ڈالتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا سر سید کے حالات میں اس طرف واضح اشارے کیے ہیں، اور خود سید محمود کے بارے میں جو مضمون ہے اس میں ان کو ''ایک شاندار انسانی کھنڈر'' سے تشبیہ دی ہے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون سید محمود کی وفات کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ تعزیتی جلسوں میں عموماً رسمی باتیں ہوتی ہیں اور بقول سعادت حسن منٹو، مرنے والے کو رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے اس مضمون میں موقع کی مناسبت سے رسمی باتیں نہیں کیں۔ سید محمود کی شخصیت پر بے باکی سے قلم اُٹھایا ہے۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کے متعلق بڑی متوازن رائے دی ہے :-

"اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ، ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی ہے۔"

"وہ محبت اور مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُس کے جان نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔"

ان دو عبارتوں میں مولوی صاحب نے مولانا محمد علی کے کردار کی بڑی شاندار تصویر کشی کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مولانائے مرحوم کے بعض عقیدت مند یہ تصویر پسند نہ کریں، لیکن وہ یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ مولوی صاحب کی "بے باکی" حقیقت پر مبنی ہے۔

مولوی صاحب کے دو شخصی خاکے ایسے ہیں جن کی اُردو ادب میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ یہ دونوں مضمون ایسے اشخاص کے بارے میں ہیں جو نہ تو بڑے سیاست دان تھے، نہ ادیب و شاعر۔ یہاں تک کہ ان میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ جس کی وجہ سے ان کے جاننے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا۔ ان میں ایک مالی تھا اور ایک سپاہی۔

"دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ع پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے۔" (چند ہم عصر ص ۱۲۴)

یہ وہ تمہیدی سطور ہیں جو مولوی صاحب نے "نور خاں" کے حالات لکھنے سے پہلے سپرد قرطاس کی ہیں۔ نور خاں — 'گدڑی کا لال' معمولی آدمی تھا لیکن اس کے کردار کی بعض خصوصیات بڑی غیر معمولی تھیں۔ انہی خصوصیات نے مولوی صاحب کو متاثر کیا اور انہوں نے یہ خاکہ لکھا۔ اسی طرح نام دیو مالی ایک عام انسان تھا لیکن اسے اپنے کام سے جو لگن اور عشق تھا وہ مولوی صاحب کے لیے کشش کا باعث ہوا اور انہوں نے اس کی سیرت کشی کی۔ یہ دونوں شخصی خاکے بہترین انسانی مطالعے ہیں۔ یہ دونوں کردار ہمارے ادب میں لافانی حیثیت حاصل کرچکے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق کے قلم ہی کی سچائی ہے کہ معمولی آدمیوں کو انہوں نے زندہ جاوید کر دیا۔

مولوی صاحب کے شخصی مضامین کی ایک خصوصیت اور بھی بہت دل چسپ ہے۔ اور وہ یہ کہ — اگر اس

مجموعے کا نام "چند ہم عصر" کی بجائے ـــ "یاد رفتگاں" ہوتا، تو کوئی فرق نہ پڑتا ۔ مولوی صاحب نے اپنے کسی ہم عصر کا خاکہ اس کی زندگی میں نہیں لکھا ' تمام خاکے ہم عصروں کے مرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان خاکوں کی صورت موجودہ صورت سے مختلف ہوتی ۔ بات یہ ہے کسی شخص کی زندگی میں تعریف و مدح کے علاوہ اس کے بارے میں کچھ لکھنا ذرا جرأت کی بات ہے ۔ مجھے مولوی صاحب میں اس جرأت کی کمی نظر آتی ہے لیکن یہ کمی اس وقت کچھ زیادہ اہم معلوم نہیں ہوتی، جب ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ ان مضامین کو لکھوانے کی محرک، شخصیتوں کی موت ہے ۔ اگر یہ لوگ مولوی صاحب کی زندگی میں نہ مرتے تو مولوی صاحب کبھی ان پر قلم نہ اٹھاتے ـــ ان لوگوں کی دائمی مفارقت کے احساس ہی نے مولوی صاحب سے یہ مضامین لکھوائے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے شخصیتوں کی جو تصویریں پیش کی ہیں' وہ زندگی سے بھر پور ہیں۔ یہی بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ مولوی صاحب نے یہ مضامین لکھنے کے لیے ہم عصروں کے مرنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ ان کو موجود نہ پاکر دل کی تسکین کے لیے ان کی "لفظی تصویریں" تیار کرلیں ۔ اور یہ اچھا ہی ہوا کہ مولوی صاحب نے کسی زندہ انسان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ۔ اگر "چند ہم عصر" کے مضامین متعلقہ افراد کی زندگی کے دوران لکھے جاتے تو اردو ادب ایک متاع گراں مایہ سے محروم رہ جاتا ۔

"چند ہم عصر"، جہاں دوسروں کی داستان ہے، وہیں اس میں خود نوشت سوانح عمری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ان خاکوں سے بے نقاب ہوتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار کے لیے بنیادی مواد اسی کتاب سے مل سکتا ہے۔ مولوی صاحب کے ذہنی رحجانات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کا مشاہدہ بھی اس دریچے سے ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیوں کو مولوی صاحب نے اپنا موضوع بنایا ہے، ان کی کوئی نہ کوئی خصوصیت خود مولوی صاحب میں بھی موجود ہے۔ وہ سر سید کی طرح ثقافتی رہنما ہیں۔ حالی کی طرح سادگی پسند ہیں۔ محمد علی جوہر کی طرح جذباتی ہیں۔ میرن صاحب کی طرح وضعدار ہیں اور نام دیو مالی کی طرح کام سے عشق رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب نے اردو ادب کو شخصی مرقع نگاری کا سلیقہ سکھایا ہے۔ انسان کو سمجھنے کا انداز دیا ہے۔ شخصیتوں کا مطالعہ کرنے کی راہ سجھائی ہے۔ یہ مرقعے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ان سے زندگی کرنے کے فن کی نزاکتوں کا پتہ چلتا ہے، اور نشیب و فراز زمانہ سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔

آردو کا تمام قدیم ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہے اور یہ مخطوطات بھی ادھر آدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان جواہر پاروں کا تحفظ نہایت ضروری ہے کیوں کہ آردو زبان کی تاریخ انہی سے وابستہ ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اردو کے قدیم سرمایے کے تحفظ کو بھی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ انہوں نے بہت سی نادر کتابوں کو کثیر سرمایے اور بڑی مشکلوں سے فراہم کیا۔ ان کی ترتیب و تدوین میں جان کھپائی اور آنہیں عالمانہ مقدموں کے ساتھ شایع کیا۔ آردو کے بہت سے اہم تذکرے انہی کی اس جگر کاوی کی وجہ سے محفوظ رہ گئے۔ بعض دوسری شعری اور نثری تصانیف بھی ان کی وجہ سے منظر عام پر آئیں۔ مخطوطات کی تدوین ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے بڑی محنت اور جگر کاوی کی ضرورت پڑتی ہے یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں اور پھر آردو میں تو اس کی پہلے سے کوئی اہم مثال موجود ہی نہیں تھی۔ یہ مولوی صاحب ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس طرف خود توجہ کی اور دوسروں کو متوجہ کیا اور اس طرح اہم ادبی سرمایہ زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گیا۔

زبان کا عشق آنہیں ہر میدان میں لے گیا اور ہر جگہ ان کی طبع کی جولانیوں نے نئے نئے راستے تراشے۔ وہ ایک ماہر لسانیات ہیں اور کئی زبانیں جانتے ہیں اور آردو زبان کی تو ایک ایک ادا سے واقف ہیں۔ لغت نگاری سے آن کا انہماک شروع سے ہے اور ہند و پاکستان میں صرف وہی

اس فن کے ماہر ہیں۔ انگریزی اردو لغت کی تیاری میں اگرچہ انہیں اہل علم کی ایک پوری جماعت کا تعاون حاصل رہا لیکن کام کا بڑا حصہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح انہوں نے ایک اردو لغت بھی تیار کی ہے جو ابھی شایع نہیں ہوئی۔ زبان کی قواعد سے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک ''صرف و نحو اردو،، اور دوسری ''قواعد اردو،، ثانی الذکر کتاب اپنے موضوع پر درجۂ استناد رکھتی ہے۔ اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اردو میں قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن جو مقبولیت اس کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی۔

مولوی صاحب کے تنقیدی و تحقیقی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو وہ صف اول کے نقاد و محقق نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بہترین نمونہ دو کتابیں ہیں۔ (۱) اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام۔ (۲) ملک الشعرائے بیجاپور — ملا نصرتی — اس کے علاوہ قدیم اردو ادب سے متعلق بہت سے مضامین رسالہ ''اردو،، میں شایع ہو چکے ہیں۔

تحقیق اور تنقید کا بہت گہرا تعلق ہے۔ تحقیقی مزاج کے بغیر نقاد، اور تنقیدی شعور کے بغیر محقق بننا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ایک نقاد کے لیے محقق ہونا اور محقق کے لیے نقاد ہونا ضروری ہے۔ ورنہ محقق کو یہ معلوم نہ ہو

سکے گا کہ کون سا موضوع اس قابل ہے کہ اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہئیے اور نقاد یہ نہ جان سکے گا کہ جس موضوع پر وہ اپنے خیالات ظاہر کر رہا ہے اس کی صحیح نوعیت کیا ہے۔

مولوی صاحب محقق بھی ہیں اور نقاد بھی، لیکن ان کی پہلی خصوصیت کچھ اس درجہ نمایاں ہے کہ دوسری خصوصیت دب کر رہ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب کے تنقیدی کارنامے پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ رسالہ ''اردو'' میں جو مضمون شایع ہوئے، وہ ابھی کتابی شکل میں مرتب نہیں ہوئے، اس وجہ سے وہ نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ لیکن جب یہ کتابی شکل میں سامنے آئیں گے تو مولوی صاحب کو ایک بڑے محقق کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نقاد بھی ماننا پڑے گا۔

مولوی صاحب نے ادب اور تنقید کے بنیادی مسائل پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ اس بارے میں انہوں نے اپنی مختلف تحریروں میں ضمنی طور پر اظہار خیال کیا ہے، جس کو پیش نظر رکھ کر ایک با شعور قاری مولوی صاحب کے ادبی نظریات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

مولوی صاحب ادب کو زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کے خد و خال کی عکاسی کرے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے جا بجا اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

> "ادب زندگی کا جز ہے۔ ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہو گا۔"
> (خطبات ص ۸۶)

> "ادب کی بنیاد زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچرسی کہانی ہے۔" (خطبات ص ۳۹)

ادب کو وہ معاشرے کا عکاس سمجھتے ہیں۔ حالی کی طرح وہ بھی اس خیال کے پوری طرح حامی ہیں کہ ہر عہد کا ادب اپنے گردو پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک جگہ شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> "ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے۔ (مقدمات حصہ دوم ص ۴۶)

ان کا خیال ہے کہ ادب بغیر کسی مقصد کے ادب نہیں بلکہ فرار کا ایک ذریعہ ہے۔ مقصدیت کو وہ ادب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت شناسی کی شرط کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو گرد و پیش کے حالات سے بے خبر ہوکر فردوس تخیل میں پناہ لیتے ہیں' وہ اُن کے نزدیک ادیب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔

"ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ
تلامیذالرحمان ہیں۔ مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت
سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے دلوں پر ہر وقت
آسمان سے الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن
اگر اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کرنا منظور
نہیں تو انہیں اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک
زمین پر اترنا پڑے گا۔ ورنہ ان کی شاعری کو
کوئی آنکھ اٹھاکر بھی نہ دیکھے گا۔"
(خطبات ص ۴۰)

ادب سے وہ زندگی کے بنانے اور سنوارنے کا کام لینے کے قائل ہیں وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ادب کا زندگی کے ہر شعبے سے تعلق ہے۔ جہاں ادب معاشرے سے متاثر ہوتا ہے وہیں یہ معاشرے کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

"علم و ادب اس قدر وسیع ہے جس قدر حیات
انسانی، اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر
پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی معاشرتی
اور سیاسی ترقی میں مدد دیتا اور نظر میں وسعت،
دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات
میں تغیر پیدا کرتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے
میں ایک قوی آلہ ہے۔"
(مقدمات جلد دوم ص ۲۰۴)

وہ ادیب کو زندگی کی حقیقتوں سے نظر چراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا ایمان ہے کہ اگر ادیب میں اتنی سکت نہیں کہ وہ زندگی کی مشکلوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے تو اس کے ادب میں ہرگز وہ توانائی پیدا نہ ہوگی، جو زندگی کو بنانے سنوارنے کے کام آتی ہے۔ ادب کو وہ محض ذہنی لذت کا ذریعہ نہیں سمجھتے —

"یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب و شاعر۔۔۔ زندگی کی کشمکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کتراتے ہیں۔ اس لئے وہ عالم خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دل فریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے رہتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ شعر و ادب صرف "حظ نفس" کے لئے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حظ نفس کے ساتھ قوت روح بھی ہوجائے۔" (خطبات ص ۶۳)

یہاں تک کہ وہ شعر و ادب سے "آلات حرب" کا کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں :—

"اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں (شعر و ادب) سے آلات حرب کا کام لینا چاہئیے۔ آلات حرب سے خدا نخواستہ میری مراد یہ نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کریں — نہیں، بلکہ اس سے

زندگی کی جنگ میں کام لینا چاھئیے۔ اس کے ذریعے سے دلوں کے ابھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توھمات کی بیخ کنی میں مدد لیجئے۔ (خطبات ص ۶۳)

مولوی صاحب ادب کے لئے تازگی اور جدت کی خصوصیت کو بہت اھم سمجھتے ھیں، کیونکہ یہ دونوں خصوصیات ممد حیات کاموں کی بنیاد ھیں، ادب بھی ایک ممد حیات کام ھے۔ اور اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ھیں:۔

"ممد حیات وہ کام ھیں جن میں تازگی اور جدت ھوتی ھے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے ھیں اور نئی راھیں سجھاتے ھیں اور شوق کو سردہ نہیں ھونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ھے۔ یہ بھی ممد حیات کاموں سے ھے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ھیں۔ دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کرسکتے ھیں۔" (خطبات ص ۱۱)

مولوی صاحب کے ذھنی رجحانات کی تشکیل و تعمیر میں سر سید کی عقلیت پسندی اور حالی کی حقیقت بیانی کا بہت حصہ ھے۔ وہ ان دونوں عہد آفریں شخصیتوں سے بہت متاثر ھوئے۔ خاص طور پر ادب کے معاملہ میں وہ حالی

سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ حالی کی طرح وہ ادب سے اصلاح کا کام لینے اور اسے زندگی کی جد و جہد میں برابر کا شریک رکھنے کے قائل ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ قدیم ادب پر قانع ہوجانے کو مناسب نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ موجودہ ادب کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئیے اور پرانے ادب میں جو باتیں معیوب ہیں اُن کو ترک کردینا چاہئیے :-

"ہمیں صرف اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہئیے ، بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح کی ... لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے گذشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے، لیکن سب کچھ نہیں .... اس لئے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئیے - جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہوگئی ہیں اُن کے بدلنے اور ترک کرنے میں، اور جو کارآمد اور مفید ہیں اُن کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہئے۔" (خطبات ص ۸۹)

مولوی صاحب کے نزدیک ادب کو "جدید" اور "قدیم" کے خانوں میں بانٹنا مناسب نہیں۔ وہ اس سلسلے میں اقبال کے ہم آواز ہیں :

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

وہ ہر اس چیز کو ترک کرنے کا مشورہ نہیں دیتے جو قدیم زمانے سے تعلق رکھتی ہے، اور نہ ہر اُس چیز کو اپنانے کے حامی ہیں جو آج کے زمانے کی پیداوار ہے۔ ادب اگر صحت مند ہے تو وہ خواہ کسی زمانے میں کیوں نہ ہو سب کے لیے قابل قبول ہونا چاہئیے۔ تازگی، جدت اور خیالات کی گہرائی ایسی خصوصیات ہیں جو ہر زمانے میں ایک ادب پارے کو مقبولیت سے ہم کنار کر سکتی ہیں:-

"ادب میں نیا پرانا کوئی چیز نہیں۔ جس کلام میں تازگی، جدت اور خیالات کی گہرائی ہے وہ ہمیشہ نیا ہے گو وہ دوہزار سال پہلے کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو اور جس میں یہ نہیں وہ پرانا ہے گو وہ آج ہی کی تصنیف کیوں نہ ہو۔" خطبات (ص ۳۰۲)

وہ قدیم اور جدید دونوں ادبیات کی قدر کرتے ہیں۔ نئے ادب کی تشکیل کے لئے وہ قدیم ادبی روایتوں کو نظر انداز نہیں کرتے :-

"ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسب ضرورت فائدہ اٹھانا چاہئے اور ایسے ادب کی بنیاد جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو

اور پھر آیندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات کے
مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ
سلسلہ برابر جاری رہے۔" (خطبات ص ۶۹)

گویا ادب زندگی کی طرح ایک مسلسل عمل ہے اور اس میں اصلاح و ترقی کی گنجایش ہر حال اور ہر زمانے میں رہتی ہے۔ ادب کا یہی صحت مند نظریہ کسی ادب پارے کی حیات جاوید کا ضامن ہوسکتا ہے۔ وہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی اصطلاحوں میں گم ہونا پسند نہیں کرتے :-

"رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات
کا ہر ذرہ حرکت میں ہے۔ رجعت یا ترقی ہر زمانے
کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ
خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے
سے ہے، سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں۔"
(خطبات صفحہ ۶۹)

الغرض مولوی صاحب ادب کو زندگی کا آئینہ بھی سمجھتے ہیں اور زندگی کے حسن کو بڑھانے کا ذریعہ بھی۔ وہ اسے کسی عالم میں سماج سے علیحدہ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں ۔ ادب کے ظاہر اور باطن دونوں پر ان کی نظر بہت گہری ہے ۔ حالی کی طرح وہ خیال کی اولیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن بیان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے :-

"شے ایک ہی ہوتی ہے لیکن اس کے دو
رخ ہوتے ہیں ایک باطن، دوسرا ظاہر۔ ظاہر
اسلوب بیان اور الفاظ کا صحیح استعمال وغیرہ

ہے۔ باطن، خیال یا موضوع جو اصل مقصد ہے۔ خیال کیسا ہی اہم اور وقیع کیوں نہ ہو اُس کے اظہار کا ذریعہ لامحالہ الفاظ یا زبان ہے۔ اور یہی ایک ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ادب کے بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ حسن بیان ہی خیال میں دل کشی پیدا کر کے لوگوں کے دلوں میں اسے جاگزیں کرتا اور تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اصل غایت خیال ہے اور حسن بیان ذریعہ ۔ لیکن طرز بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے ۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے جسم کو روح سے اور روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے۔"

(مقدمہ "اُردو تنقید کا ارتقا")

مولوی صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ ادیب کو لکھنے کی پوری پوری آزادی ہونی چاہئے ۔ اس پر موضوعات کے انتخاب کی پابندی عائد نہ کی جائے لیکن اسے یہ اجازت نہیں ہونی چاہئیے کہ وہ بھونڈے پن سے لکھے:۔

"ادیب کو حق حاصل ہے اور اُسے آزادی ہونی چاہئیے کہ جو چاہے لکھے لیکن اُسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔" (خطبات ص ۶۷)

لفظ کے صحیح استعمال پر وہ بہت زور دیتے ہیں کیوں کہ یہی ایک ذریعہ ہے جس پر عمل کر کے ادیب اپنے خیالات کو مؤثر بنا سکتا ہے :-

"لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے ..... دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔" (چند ہم عصر ص ۱۶۸)

عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کو وہ اچھے ادب کے مقاصد کے منافی سمجھتے ہیں۔

"عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات و واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو۔"
(چند ہم عصر ص ۲۸۲)

ادبی تنقید نگاری کی اہمیت اور قدر و قیمت سے مولوی صاحب پوری طرح واقف ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ تنقید کے مقاصد بہت وسیع ہیں اور اس کے بغیر صحت مند ادبی فضا پیدا نہیں ہوسکتی لیکن وہ ہر شخص کو نقاد بننے کا اہل نہیں سمجھتے۔ اس کے لیے کچھ شرطیں ہیں :-

"تنقید صحیح ذوق کے لیے لازم ہے، لیکن ایک نقاد کے لیے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام

میں ھاتھ ڈالتا ھے، وسیع معلومات، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ھے۔ صحیح تنقید مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لیے مفید ھے۔،،

(خطبات ص ۱۴)

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتے ھیں :-

،، تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ھے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کی باعث ھے۔ اسے ذاتی اظہار کی قدر کرنے کا موقع دیتی ھے اور ضبط سکھاتی ھے۔ ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر ضروری شفیتگی سے بچاتی ھے اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ھے، یعنی بریک کا کام دیتی ھے۔ پڑھنے والوں کے لیے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ھے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی اور محرک بن کر اُن کی رھنمائی کرتی ھے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لیے تنقید لازم ھے۔،، (مقدمہ ،،اردو تنقید کا ارتقاء،،)

یہ تھے مولوی صاحب کے ادب و تنقید سے متعلق اصول و نظریات ۔ ان کی عملی تنقید انہی اصولوں اور نظریوں کی تفسیر ھے۔ انہوں نے جب بھی کسی موضوع پر قلم اُٹھایا ھے اُس کا حق ادا کردیا ھے۔ کسی فنکار کے بارے میں

لکھتے ہوئے وہ اس کی زندگی کے حالات، اس کے مزاج کی خصوصیات اور اس کے زمانے کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں وہ آج کل کے نقادوں کی طرح سیاسی و سماجی حالات کو تمام جزئیات کے ساتھ اس طرح بیان نہیں کرتے کہ اصل موضوع کی اہمیت ہی ختم ہوجائے۔ آج کل کے بعض نقاد جب کسی فنکار پر لکھتے ہیں تو اس کے سال پیدائش سے لے کر سال وفات تک کے تمام تاریخی واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کردیتے ہیں۔ جن کا براہ راست فنکار کی زندگی اور فن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ادبی تنقید میں سیاسی حالات کو بطور پس منظر کے اس حد تک بیان کرنا چاہئے کہ ان کے وہ اثرات واضح ہو جائیں جو فن کار کی شخصیت نے قبول کیے، اور جن کے تحت اس کے ذہنی رجحانات کی تشکیل ہوئی۔ مولوی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے۔ وہ عملی تنقید میں سیاسی و سماجی حالات کو اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ فنکار کی سیرت اور اس کے فن کا مطالعہ کرنے مین بڑی آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔ ''مقدمہ انتخاب کلام میر'' اس کی بہترین مثال ہے۔ انھوں نے میر کے شعری محرکات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا ہے اور دکھایا ہے کہ زمانے کے حالات نے میر کی شخصیت اور فن پر کیا اثر ڈالا۔

مولوی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے عالمی ادب سے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ صرف اردو ہی نہیں، بلکہ مشرق و مغرب کی کئی زبانوں کے ادبیات

پر اُن کی نظر بہت گہری ہے۔ ادبیات کے علاوہ دیگر سماجی علوم سے بھی وہ بخوبی آشنا ہیں۔ مختلف ادبی علمی، عمرانی، سیاسی تحریکات اور رجحانات سے اُن کی آشنائی قابلِ رشک ہے۔ ان سب خصوصیات نے ان کی عملی تنقید کو بہت متوازن بنادیا ہے۔ وہ صرف خوبیوں یا صرف خامیوں سے ہی سروکار نہیں رکھتے، بلکہ ادب پارے کا تجزیہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں خود بہ خود واضح ہوجاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض جگہ وہ تحسین و تعریف کرتے ہوئے مبالغے کی حد تک جاپہنچتے ہیں، لیکن ایسے مقام بہت کم ہیں اور اُنہیں بہ آسانی نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

مولوی صاحب کو اُردو زبان سے جو خاص دلچسپی ہے اس کی وجہ سے وہ تنقید کرتے ہوئے فن پارے کی زبان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اگر زبان و بیان کی غلطیاں نظر آتی ہیں تو ان کا اظہار ضرور کرتے ہیں اور اگر کوئی قابلِ تعریف پہلو ہوتا ہے تو اُس کو بھی بیان کردیتے ہیں۔ لیکن اُن کی ساری تنقید زبان و بیان تک ہی محدود نہیں ہوتی۔

مولوی صاحب کی تنقید صحیح معنوں میں سائنٹیفک تنقید ہے۔ موضوع کے ہر پہلو پر وہ اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کہیں تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حالی کے بعد اگر

کسی نے اردو میں تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ہے تو وہ مولوی عبدالحق ہیں۔ حالی نے صرف بنیاد ڈالی تھی، لیکن مولوی صاحب نے اسی بنیاد پر عظیم‌الشان عمارت کھڑی کردی۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ ہماری ادبی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔

تبصرہ نگاری تنقید ہی کی ایک شاخ ہے۔ تنقید میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا مکمل جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ تبصرے میں ایک سرسری سی نظر ڈالی جاتی ہے۔ تنقید نگار مسلمہ اصولوں کی روشنی میں لکھتا ہے۔ تبصرہ نگار کبھی کبھی ذاتی پسند اور ناپسند کو بھی معیار بنا لیتا ہے۔ بہر حال تبصرہ نگاری کے لیے تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے۔ اس کے بغیر تبصرہ، تبصرہ نہیں ہوسکتا۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ قدیم نہیں۔ غالباً ''تہذیب‌الاخلاق،، پہلا علمی رسالہ ہے جس نے اس روایت کی داغ بیل ڈالی۔ اور پھر ''الندوہ،، اور دوسرے علمی رسالوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ حالی اور شبلی اردو کے اولین تبصرہ نگاروں میں سے ہیں۔ مگر ان کے تبصرے، ان کے دوسرے علمی کاموں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ افتخار مولوی صاحب ہی کو حاصل ہے کہ ان کے تبصرے اردو تنقید کا اہم سرمایہ ہیں۔

مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا باقاعدگی سے آغاز

رسالہ '' اُردو '' کے اجراء سے ہوتا ہے اس رسالے میں انھوں نے بے شمار کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر تبصرے لکھے، جن کے ایک دو انتخابات شایع ہوچکے ہیں۔ مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کتاب پڑھ کر تبصرہ لکھتے ہیں (یہ بات میں نے اس لئے لکھی کہ اُردو کے ننانوے فیصدی تبصرہ نگار کتاب پڑھے بغیر ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کرتے ہیں۔) کتاب کی خوبیوں اور خامیوں پر وہ تفصیلی بحث تو نہیں کرتے مگر ایسے اشارے ضرور کرتے ہیں جن سے کتاب کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کی تبصرہ نگاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زیر تبصرہ کتاب میں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے کہ نہیں۔ اس سلسلے میں وہ بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کتاب اپنے موضوع کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی تو وہ بڑی سختی سے اس کا محاسبہ کرتے ہیں یہاں تک کہ اسے نشانۂ تضحیک بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔

مولوی صاحب کے تبصرے علمی تنقید کا اچھا نمونہ ہیں۔ وہ بہت کم لفظوں میں بڑی بڑی باتیں کہ جاتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے مجموعۂ کلام '' آیات و نغمات،، پر انہوں نے یہ چند سطریں لکھی ہیں:-

'' جوش صاحب کوئی نئے شاعر نہیں،
اچھے خاصے پختہ اور پرانے شاعر ہیں۔

ان کے کلام میں جوش ، روانی ، حسن بیان ، بدرجۂ کمال موجود ہے۔ اس میں زور بھی ہے اور شور بھی ۔ وہ قدیم روایات و اخلاق ، مذہب و معاشرہ ، اوہام و عقائد سے سخت بیزار ہیں اور مستانہ وار انہیں ٹھکراتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ سلام اور نوحے یا اس قسم کی نظمیں لکھتے ہیں (جیسا کہ اس مجموعے میں پائی جاتی ہیں) تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل پرانے اوہام اور عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں ۔ انقلاب ، نظام جدید اور جدید رنگ پر فریفتہ ہیں۔ جوش و خروش اور انقلاب کے نغموں سے ان کا کلام گونج رہا ہے۔ لیکن انقلاب کیا ہے ؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انہیں بحث نہیں ۔ انہیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ اس میں تغیر تو ہے۔ ان کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے۔ جس پر بیتتی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے ، اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جوش کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور ہوتا ہے لیکن اس میں بلندی فکر اور تاثیر نہیں۔،،

(ادبی تبصرے ص ۸۸)

ان چند سطروں میں جوش کی شاعری کی تمام خصوصیات کو بیان کر دیا گیا ہے۔ جوش کے کلام پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی۔ مولوی صاحب کے تقریباً سب ہی تبصروں میں یہی شان پائی جاتی ہے۔ تبصرہ کرتے وقت مولوی صاحب کتاب کی زبان و بیان پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اگر کہیں اس قسم کی خامیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں۔ لیکن سارا تبصرہ اسی پہلو تک محدود نہیں ہوتا۔ شعری مجموعوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی چیز ہے کہ نہیں ہے۔ اگر کوئی نئی بات نظر آتی ہے تو اس کو پوری فراخ دلی سے سراہتے ہیں اور اگر رسم و روایات کی فرسودگی نظر آتی ہے تو دامن بچا کر گزر جاتے ہیں۔ ایسی کتاب جو اردو میں اپنی نوعیت کی نئی کتاب ہو اس کے لئے وہ مصنف یا مؤلف کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر تحسین و تعریف کے کلمات کے استعمال سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔

مولوی صاحب نے اپنی تبصرہ نگاری کو کبھی ادبی بد دیانتی سے آلودہ نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے نہ تو کبھی کسی کتاب پر متعصبانہ نقطۂ نظر سے کچھ لکھا اور نہ ہی کبھی کسی ایسی کتاب پر تبصرہ کیا جس کے موضوع سے ان کو واقفیت نہ ہو۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے ان کی تبصرہ نگاری نے اردو تنقید میں ایک ایسی روایت کی بنیاد رکھی ہے جو نہایت ہی صحت مند اور مستحسن ہے

کسی خراب سے خراب کتاب میں بھی انہیں کوئی کام کی بات نظر آجاتی ہے تو وہ اس کو ضرور سراہتے ہیں۔ اور اگر کسی کتاب میں کوئی ایسا مسئلہ آجاتا ہے جس پر وہ خود کو تبصرہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتے تو فوراً اس کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

"مترجمین نے اس ترجمے میں اکثر غیر مقفیٰ عبارت لکھی ہے۔ ان کے خیال میں اس کا استعمال بہ مجبوری اس لیے جائز رکھا گیا ہے کہ ہماری زبان میں بلینک ورس کا جواب نہیں اور یہ مجبوری اس لیے واقع ہوئی کہ ایکٹروں کو ربط عبارت کے یاد رکھنے میں آسانی ہو۔ اس پر وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو ناٹکوں کے تفصیلی حالات سے واقف ہو۔ ہم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے۔"

(ادبی تبصرے ص ۳۰)

ایسی بات لکھنا بڑے ظرف کی بات ہے۔ اسی کو ادبی دیانت کہتے ہیں اور یہی چیز مولوی صاحب کے تبصروں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اسلوب بیان کیا ہے؟ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ اسلوب شخصیت کا عکس ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ جیسے خود شخصیت ہی اسلوب ہو۔ یعنی اسلوب تصویر نہیں "صاحب تصویر" ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادیب کی انفرادیت ہی اس کا اسلوب ہے۔ انسان کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کے ذہنی رجحانات بڑا اہم حصہ لیتے ہیں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انفرادیت کی تشکیل ہی یہی کرتے ہیں۔ ذہنی رجحانات جب ایک عرصے کی تگ و دو کے بعد کوئی مخصوص صورت اختیار کر لیتے ہیں تو انسان کی انفرادیت وجود میں آتی ہے جو اسے اپنے ہم جنسوں سے ممیز کرتی ہے اور پھر اس کے ہر فعل میں یہ انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ادیب کی تحریر کو بھی ایک مخصوص رنگ اور روپ یہی انفرادیت عطا کرتی ہے اور اسی رنگ اور روپ کا دوسرا نام "اسلوب" ہے۔

ادب خیال اور بیان کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ خیال کی اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن خیال کو اگر مناسب اور موزوں طریقے سے ادا نہ کیا جائے تو ادبیت مجروح ہو جاتی ہے۔ ایک واقعہ جب ایک اخبار نویس بیان کرتا ہے تو وہ "خبر" بن جاتا ہے لیکن جب اس واقعہ کو ایک ادیب بیان کرے گا تو وہ فن پارہ بن جائے گا۔ وہ عنصر جس نے خبر کو "فن پارے" کا درجہ عطا کیا ادب کی بنیاد ہے۔ اسلوب کا تعلق اسی عنصر سے ہے۔ ایک ادیب اپنے اسلوب سے وہی جادو جگاتا ہے جو ایک مصور رنگوں کے امتزاج اور خطوط کے تناسب سے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں ادیب کا اسلوب ایسا ہے اور فلاں کا ایسا تو اس وقت ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ادیب نے اپنے موضوع کو پیش کرنے کے لئے بیان کا کیسا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ ایک ادیب کے جملوں کی ساخت، لفظوں کے استعمال اور بات کہنے کے طریقے سے اس کے اسلوب کی خصوصیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولوی صاحب کے اسلوب کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کی انفرادیت کی تشکیل میں جن ذہنی رجحانات نے حصہ لیا ہے اُن کی نوعیت کیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی جب سر سید کی عقلیت پسندی کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ عبارت آرائی قافیہ پیمائی اور تصنع سے بھرپور تحریروں کا رواج اُٹھ چکا تھا۔ ہر بات صاف اور سیدھے انداز سے کہی جانے لگی تھی۔ مولوی صاحب سر سید سے اور پھر مولانا حالی سے بہت متاثر ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں کے خیالات انہوں نے اپنائے بلکہ ان کے طرز تحریر سے بھی متاثر ہوئے۔ ان دونوں کی سادگی اور سادہ بیانی کا اثر مولوی صاحب کے اسلوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سر سید کا اسلوب اگرچہ بہت سادہ و آسان ہے لیکن اس میں کہیں کہیں ”اکھڑ پن،، پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سر سید کے ہاں ”ادبیت،، کی حیثیت ثانوی ہے اور ”مقصدیت،، کو اولیت حاصل ہے۔ ان پر ”اصلاح،، کا

خیال اس حد تک طاری تھا کہ وہ تحریر کی خوبیوں یا خامیوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ مولانا حالی کا اسلوب سر سید سے قدرے بہتر ہے۔ اس میں اگرچہ اکھڑ پن نہیں پایا جاتا، مگر وہ جاذبیت بھی نہیں ہے جسے "ادبی حسن" کہا جا سکے۔ اس کا سبب بھی وہی "مقصدیت" کی اولیت ہے۔ بہرحال یہ مسلم ہے کہ حالی کا اسلوب بے داغ ہے لیکن وہ شبلی کے اسلوب کی طرح رنگین بھی نہیں، یہ فرق طبیعتوں اور شخصیتوں کے باہمی اختلافات کا نتیجہ ہے۔

مولوی عبدالحق نے حالی اور سرسید سے سادگی اور سادہ بیانی لی، لیکن ان کا اسلوب صرف انہی دو عناصر سے عبارت نہیں ہے۔ ان کے ہاں ایک تیسری خصوصیت بھی پائی جاتی ہے جسے "رنگینی" کہا جاسکتا ہے اور یہ خصوصیت انہیں شبلی سے ملی ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریروں میں کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ جہاں شبلی کو "مطعون" کیا جاسکے لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ وہ اسلوب کے معاملے میں شبلی سے اتنے ہی متاثر ہیں جتنا کہ حالی اور سرسید سے۔ واضح رہے کہ مولوی عبدالحق مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ حالی اور سرسید سے ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف ہے۔ شاگرد کا استاد سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے اور اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مولوی صاحب شعوری یا غیر شعوری طور پر شبلی کے

انداز تحریر سے متاثر ہوئے۔ گویا مولوی صاحب کے اسلوب بیان کی تین خصوصیات ہیں، سادگی، سادہ بیانی اور رنگینی۔ سادگی سے مراد یہ ہے کہ عبارت آرائی اور دیگر تصنعات سے اجتناب کیا جائے، ''سادہ بیانی،، یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ دو ٹوک انداز میں کہا جائے، موضوع کی مناسبت سے کہا جائے، نیز پیچیدگی اور الجھاؤ سے دامن کشی کی جائے۔ ''رنگینی،، کا مطلب یہ ہے کہ نثر میں وہ لطافت پیدا کی جائے جو ''ادبی حسن،، کہلاتی ہے۔ یہ تینوں خصوصیات جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے مولوی عبدالحق کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔

مولوی صاحب لفظوں کے بہت بڑے مزاج دان ہیں۔ انہیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ ''الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جان دار ہیں۔ وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، مرتے، بڑھتے اور گھٹتے رہتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گزشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرے کی یادگار ہے۔ وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنا سے اعلا اور اعلا سے ادنا، شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہوسکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے۔ یہ انشا پردازی کا بڑا گر ہے۔'' (تنقیدات

ص ۱۱) مولوی صاحب کو انشا پردازی کا یہ گر معلوم ہے، وہ جس جگہ جو لفظ استعمال کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اسی جگہ کے لیے وضع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ یہ لفظ کس زبان سے اردو میں آیا ہے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ جس مقصد کے لیے یہ لفظ اردو میں آیا ہے وہ پورا ہوتا ہے کہ نہیں۔ ان کی نثر ابوالکلام آزاد کی طرح صرف عربی اور فارسی لفظوں کی محتاج نہیں بلکہ وہ ہندی لفظوں کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔ غریب سے غریب لفظ بھی ان کی نثر میں آکر بڑا مانوس دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کہیں متروکات کے استعمال کو بھی روا رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ آخر ان الفاظ کو متروک کیوں قرار دیا گیا۔ وہ ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں جو ہماری زبان کے مزاج پر پورے نہیں اترتے یا جن کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

مولوی صاحب بڑے بڑے جملوں کے عادی نہیں، وہ چھوٹے چھوٹے مربوط جملوں سے بڑی متوازن نثر لکھتے ہیں۔ چھوٹے جملے لکھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خیال کو دوسروں تک پہنچنے میں بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ ان کی نثر کو حسین بنانے میں نادر و خوبصورت تشبیہات کو بھی بہت دخل ہے۔ ان کی تحریر میں تشبیہیں محض لطافت بیان کے لئے نہیں ہوتیں، بلکہ ان سے مفہوم کی وضاحت کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مولانا محمد علی کے بارے میں وہ

لکھتے ہیں :-

''وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتا تھا، لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہوجاتا تھا کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی - دوست بھی اُس کے جاں نثار اور فدائی تھے لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔'' (چند ہم عصر ص ۱۰۳)

مولوی چراغ علی کے بارے میں لکھتے ہیں :-

'' حیدرآباد میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک بکھیڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جا تا ہے وہ اسی طرح سے رہے جیسے طوفان موج خیز میں لائٹ ہاؤس -'' (چند ہم عصر ص ۹۴)

اسی طرح اور بھی بہت سی تشبیہات پیش کی جا سکتی ہیں جو مولوی صاحب کی تقریباً تمام تصانیف میں موجود ہیں - مولوی صاحب کبھی کبھی طنز و مزاح سے بھی اپنی تحریر میں دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ طنز کا استعمال تو وہ وہاں کرتے ہیں جب وہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ بات کرنے کا عام انداز مؤثر نہیں ہوسکتا ۔ انہوں نے تذکرہ ''اعجاز سخن'' پر جو تبصرہ لکھا ہے وہ بہت ہی دل چسپ ہے اور طنز کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کتاب کو

"سلسلہ ستم ظریف بک ڈپو" کی طرف سے شایع کیا گیا تھا - مولوی صاحب بہت سی باتیں کہنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں :-

"ابتدا میں مجھے تعجب ہوا تھا کہ یہ کتاب "سلسلہ ستم ظریف" میں کیوں داخل کی گئی لیکن کتاب ختم کرنے کے بعد ثابت ہوا کہ بے شک وہ اسی سلسلے کے لائق تھی۔"
(تنقیدات ص ۳۸)

اسی طرح "ناٹک ساگر" کے تبصرے میں لکھتے ہیں :-

"ناظرین کو حیرت ہوگی کہ یہ پونے پانسو صفحے کی کتاب ایک ہفتے میں چھپ کر تیار ہوئی ہے - یہ لاہور کے مطابع کا کمال ہے۔ یہ تو خیر چھپائی کا کام ہے - ہم نے سنا ہے کہ وہاں کے بعض اہل قلم ہفتہ بھر میں ایسی ضخیم کتاب تصنیف کر ڈالتے ہیں۔"
(ادبی تبصرے ص ۵۴)

اس سلسلے میں وہ بعض اوقات اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے - انجمن ترقی پسند مصنفین ہند کے جلسے کا خطبہ صدارت ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں :-

"آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا، چلتے چلتے رستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا - اس وقت بے ساختہ اس کی

زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی۔" پھر جھٹ اٹھ کر ادھر ادھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں تو کہنے لگا "جوانی میں کون سے تیر مارے تھے۔" جب میں ایسے قابل نوجوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اس وقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہے۔"

غرض مولوی صاحب کا اسلوب بڑا باغ و بہار ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ مولوی صاحب کا اسلوب اردو کے بنیادی اسالیب میں سے ہے۔ میں اس پر صرف اس قدر اضافہ چاہوں گی کہ صرف اسی اسلوب سے اردو زبان کی صلاحیتوں اور وسعتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اَدَبْ و شِعر

ادب اور زندگی

مجد حیات وہ کام ہیں جن میں تازگی اور جدت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ ادب بھی مجد حیات کاموں میں سے ہے، اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں، دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کرسکتے ہیں، زندگی کو زیادہ پر لطف اور زیادہ کار آمد بنا سکتے ہیں اور ملک و قوم کی ترقی کے رستے پر لگا دینے میں مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن ادب وہی کارآمد ہو سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے اور جس میں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اور ان میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہے ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہو سکتی ہے۔ (خطبات ص ٦٦-٦٧)

ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک لچر سی کہانی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ (خطبات ص ۳۹)

ادب زندگی کا جز ہے، ہماری تہذیب اور تمدن کا آئینہ ہے۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی

ہمارا ادب ہوگا۔ (خطبات ص ۸۶)

علم ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیات انسانی اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا اور نظر میں وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیر پیدا کرتا ہے بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے۔ قومیت کے لئے ہم خیالی شرط ہے اور ہم خیالی کے لئے ہم زبانی لازم۔ گویا یک زبانی قومیت کا شیرازہ ہے جو اسے منتشر ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ (مقدمات دوم ص ۲۰۴)

یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر ...... زندگی کی کشمکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کتراتے ہیں۔ اس لئے وہ عالم خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دل فریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ شعر و ادب صرف "حظ نفس" کے لیے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حظ نفس کے ساتھ قوت روح بھی ہو جائے۔ ہمیں شعر و ادب کی ان تعریفات سے فی الحال قطع نظر کر لینا چاہیے جو فارغ البال اور عیش پرست قوموں نے کی ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ ہم طرح

طرح کی کشا کشوں میں گرفتار ہیں، ان سے آلات حرب کا کام لینا چاہئے۔ آلات حرب سے خدا نخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کریں - نہیں، بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہئے - ان کے ذریعے سے دلوں کے ابھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توہمات کی بیخ کنی میں مدد لیجئے - جس دل میں آگ نہیں وہ دوسروں میں چنگاریاں کیوں کر پیدا کر سکتا ہے۔ جس دل میں لگن نہیں وہ دوسروں کو کیسے ابھار سکتا ہے۔ یہ لگن کہاں سے اور کیوں کر آئے؟ یہ اس وقت پیدا ہوگی جب آپ میدان میں آئیں گے، لوگوں کی بھیڑ میں گھسیں گے، کھوے سے کھوا چھلے گا، ہر طرف سے ٹکریں لگیں گی، مشکلات کا سامنا ہوگا، اس وقت آنکھیں کھلیں گی، زندگی اصلی روپ میں نظر آئے گی، اس وقت آپ کے دل پر چوٹ لگے گی اور درد اور خلوص پیدا ہوگا - اس وقت آپ کا صریر قلم ہولناک توپوں کی آواز سے زیادہ کار گر اور آپ کی زبان کا ایک ایک لفظ شمشیر کے گھاؤ سے زیادہ کاری ہوگا -

یہ سچ ہے کہ یہ زمانہ بہت نازک ہے- بے کاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ معاشیاتی پیچیدگیوں نے ملک کو خستہ کر رکھا ہے جس سے ادیب اور شاعر دونوں چوکڑی بھول گئے ہیں، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ زمانہ امتحان کا ہے، یہیں ادیب اور شاعر کے جوہر کھلتے ہیں اور یہی وقت اسے اپنے خداداد جوہر سے کام لینے کا ہے۔

جو ادیب اور صناع الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے اور کارزار زندگی میں شریک نہیں ہونا چاہتا اور خلوص کے ساتھ اپنے فطری جوہر کو کام میں نہیں لانا چاہتا وہ مجرم ہے اور اس کی سزا وہی ہے جو ایک غدار کی ہوتی ہے۔ زبان اپنی نوع انسان کی عملی اور روحانی زندگی کے لیے نہایت درجہ ضروری ہے اس لیے زبان و ادب کی ترقی (جہاں تک ممکن ہوسکے) اُسے قوم کی ضروریات اور حالات کے مطابق بنانے میں ہے۔ یہ نکتہ ہمارے ادیبوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ (خطبات ص ۴۹۔۵۰)

ادب اور مقصدیت

کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ (چند ہم عصر ص ۲۸۳)

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے اور تازگی اور جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو جس کے حصول کے لیے ہم ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ ہوں۔ جب کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہو جاتی ہے اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان

اکتا جاتا ھے اور اس بے زاری کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ عیاشی اور طرح طرح کی لغویات میں مبتلا ھو جاتا ھے، اس وقت آثار حیات گھٹنے لگتے ھیں، قویٰ میں انحطاط پیدا ھونے لگتا ھے، دل میں امنگ نہیں رھتی، دل و دماغ کے ابھارنے کے لیے طرح طرح کے محرکات استعمال کیے جاتے ھیں لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ھوتے ھیں۔ آخر اسی عالم نیم جانی میں اس کا خاتمہ ھو جاتا ھے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ھر شعبے پر صادق آتا ھے۔

(خطبات ص ۶۳-۶۴)

ادب کا ظاھر اور باطن

یہ ایک عام اور معمولی بات ھے لیکن کبھی فراموش نہیں کرنی چاھئے کہ ھر پرانی چیز بری نہیں اور ھر نئی چیز اچھی نہیں ھوتی۔ رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں، رجعت پسند اور ترقی پسند ھر زمانے میں ھوئے ھیں، اب ھیں اور آیندہ بھی ھوتے رھیں گے۔ رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ھیں۔ کائنات کا ھر ذرہ حرکت میں ھے اور ھر چیز پر تغیر کا عمل جاری ھے۔ رجعت یا ترقی ھر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ھوتی ھے۔ یہ خیال کہ ھر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانے سے ھے، سراسر رجعت سے آلودہ ھے، صحیح نہیں۔ محض اس بنا پر کہ ھم لوگ آگے بڑھ گئے ھیں گزشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاھئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ھے۔ ھم گزشتہ کے وارث ھیں۔ اگر کوئی وارث اپنے ارث سے بے خبر

ہے یا کیا حقہ واقفیت نہیں رکھتا تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین، مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہ ہو، نہ کوئی اصلاح کرسکتا ہے ، نہ خود فائدہ حاصل کرسکتا ہے ، اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ گذشتہ تاریخ اور گذشتہ ادب کا غور سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے، کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے ، کیوں کہ جو چیز آپ کو ارثاً ملی ہے، اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا؟ لیکن ''میراث پدر خواہی علم پدر آموز'' ہی کافی نہیں، ''علم پدر آموز'' بھی لازم ہے۔ ہم صرف حال ہی کے سامنے جواب دہ نہیں، آیندہ کے بھی جواب دہ ہیں۔ اس لئے زندگی کے جس شعبے میں بھی ہم ہاتھ ڈالیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آیندہ نسلوں پر کیا ہوگا کیوں کہ آیندہ زمانے میں ہمارے کاموں کی تنقیح و تنقید اسی اصول پر ہوگی۔

دوسری چیز جو آپ کے غور کے قابل ہے یہ ہے کہ جس زبان میں آپ اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں اس پر پوری قدرت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم اپنے گذشتہ ادب کا اس نظر سے مطالعہ کریں گے۔ زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ۔ اگر کسی کاری گر کا اوزار بھدا ہے تو اس کا کام بھی بھدا ہوگا۔ یہ کہنا

صحیح نہیں ہے کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات نہیں سما سکتے۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیال ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو، بہ شرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ زبان بھی ارثاً ملی ہے اور جب تک ہم اس پر قدرت حاصل نہ کریں گے ہم اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہونگے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے شاید وہ ہمارا نہیں، اصل نہیں نقل ہے، شاید مستعار ہے، کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہے، ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں، اس نے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو، یعنی جسے ہم نے خود سوچ کے پیدا کیا ہے یا کسی دوسرے کا، لیکن ہمارے دماغ میں اس قدر صاف اور روشن ہونا چاہئے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحہٴ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ لیکن جب خیال ہی ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو لامحالا تاریک اور مبہم ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کی صرف و نحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے۔ اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہئے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک

بڑی قوت ہے اور اس کا بر محل استعمال خیال میں قوت پیدا کردیتا ہے جو اس گر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور بر محل استعمال کو نہیں جانتا اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔

یہ دو چیزیں ہیں، ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے ادب کا باطن یعنی خیال۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں، یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انھیں کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے۔ اس لیے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی ساری کوشش رائگاں جائے گی اور ان کے خیالات خواہ کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔ (خطبات ص ۶۹ - ۷۰ - ۷۱)

ترقی اور اصلاح ادب میں

ہر زندہ شے کے لیے نشو و نما اور تغیر لازم ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ لیکن اگر اس قانون کے ساتھ انسانی سعی شریک نہ ہوگی تو بہت جلد وہ ترقی رک جائے گی۔ نشو و نما کی ترقی کے لیے انسانی سعی لازم ہے۔ جو چیزیں ہمیں بچپن میں بہت عزیز تھیں وہ بڑے ہوکر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ بچپن میں جو کتابیں ہم بڑے شوق سے بڑھتے تھے بڑے ہوکر ان میں وہ دل کشی نہیں رہتی۔

یہی حال ادب کا ہے۔ زمانہ گذشتہ کا ہمارا ادب اور اس کا اکثر حصہ ویسا کارگر اور پر اثر نہیں رہا جیسا کہ اُس وقت تھا۔ وہ اس زمانے کے اقتضا کے مطابق تھا اور اب زمانے کا اقتضا کچھ اور ہے۔......عمر کے ساتھ انسان کا ذوق بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس لیے ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہئیے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح میں (جہاں تک زبان کی ساخت اجازت دے) لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنی چاہئیے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے گزشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ بے شبہ گزرا ہوا زمانہ قابل احترام ہے لیکن آیندہ زمانہ اس سے بھی زیادہ احترام کے قابل ہے۔ جس شخص کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف رہتی ہے اور آگے نہیں دیکھتا وہ کبھی دنیا میں سر سبز نہیں ہو سکتا اس لیے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئیے۔ جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہوگئی ہیں ان کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کارآمد اور مفید ہین ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہئیے۔ (خطبات ص ۸۸-۸۹)

قصہٴ جدید و قدیم ــــ ادب میں

ادب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں، جس ادب

میں تازگی، جدت اور گہرائی ہے خواہ وہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو، نیا ہے، اور وہ ادب جس میں یہ خوبی نہیں خواہ وہ آج ہی کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو، پرانا ہے۔
(ادبی تبصرے ص ۸۵-۸۶)

زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے۔ اس لیے گزشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ حال کی اصلاح اور آیندہ کی تیاری میں مدد دے گا۔ ممکن ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سرا سر تخریب اور استیصال کار آمد ہو۔ یعنی جب تک ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے، نئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک پرانا بوسیدہ مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی۔ یہ تشبیہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں درست ہو لیکن ادب کے معاملے میں یہ کامل طور پر منطبق نہیں ہوسکتی۔ ترقی کے لیے تخریب ضروری ہے مگر لازم نہیں۔ ادب میں بے شک آپ کو نئے اسلوب، نئے خیالات پیدا کرنے ہوں گے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی۔ سوکھی شاخیں چھانٹنی ہوں گی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دے کر پھر ہرا کرنا ہوگا اور درخت کی جڑ میں

کھاد اور پانی ڈال کر سر سبز کرنا ہوگا تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں۔ لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا؟ ہمیں پچھلوں کے کام اور اُن کی محنتوں سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہئے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آیندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم و اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔ (خطبات ص ۶۸-۶۹)

ادب کی رہگزار

ادب صناعی ہے، صناعی میں (بر خلاف فطرت) اعادہ محال ہے۔ کسی شاعر میں کتنا ہی سوز و گداز کیوں نہ ہو، میر نہیں ہو سکتا، کوئی کیسا ہی بلند فکر کیوں نہ ہو، دوسرا غالب ہونا ممکن نہیں۔ بعد کے ادیب کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو اگلوں کی راہ پر پڑے جس میں سر سبز ہونا دشوار ہے یا اپنے لیے نئی راہ نکالے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کی راہ ہمیشہ صاف اور سیدھی نہیں ہوتی، اس میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں، اسی لیے اس کے جانچنے کے لئے ہر کونے کھدرے پر نظر دوڑانی چاہئیے۔ (خطبات ص ۱۳-۱۴)

ذوق ادب

حکیم کنفیوشس کا قول ہے کہ سب انسان کھاتے پیتے

ہیں، کوئی زیادہ کوئی کم، کوئی اچھا کوئی معمولی، کوئی طرح طرح اور قسم قسم کے کھانے کھاتا ہے، لیکن ان میں کتنے ہیں جو ذائقہ کی صحیح حس رکھتے ہیں۔ یہی حال ادب کا ہے۔ ہم میں سیکڑوں ہزاروں لکھنے پڑھنے والے، مترجم، مولف، مصنف، شاعر ہیں، لیکن ان میں کتنے ہیں جن میں ادب کا صحیح ذوق ہے۔ صحیح ذوق ادب کی جان ہے، لیکن اس کے لیے گہرے مطالعے، فکر و غور، محنت اور مسلسل کام کی ضرورت ہے۔ (خطبات ص ۳۳۶)

ادیب اور آزادی

ترقی کا رستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر اور استقلال اور بہت پتا مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ (ترقی) حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی سر زمین آزادی میں پھول پھل سکتی ہے۔ ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔ ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہئیے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے۔ ”بھونڈے پن“ کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو وہ ادب قابل مبارک باد ہے۔ (خطبات ص ۶۷)

شعر اور زندگی

شعر کہیں بند نہیں ہے۔ وہ اسی قدر وسیع ہے جس قدر کہ زندگی۔ (خطبات ص ۲۰۱)

شاعری خود ایک بڑا کمال ہے۔ اور ایسا بڑا کمال کہ اگر کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اس کے سامنے دوسرے کسب و کمال ہیچ ہیں۔ (مقدمات دوم ص ۱۶۹)

ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے۔ جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے۔ (مقدمات دوم ص ۴۶)

شاعری کے انقلابات اور تغیرات اپنے زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو شاعر سے اور اس کے زمانے سے الگ کر کے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو اس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کردینا۔ اچھا شعر کسی کا بھی ہو، مزہ دے جاتا ہے۔ لیکن جب ہم شعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائل اور عادات پر غور کی نظر ڈالیں اور اس کے بعد اس کے عہد کے واقعات و حالات اور تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں جہاں تک کہ ان کا تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے۔ کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس

کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے
(تنقیدات عبدالحق ص ۸۷)

ہمارے شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تلامیذ الرحمان ہیں، مشاہدہ، مطالعہ اور حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، ان کے دلوں پر آسمان سے ہر وقت الہام کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر انہیں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں تو انہیں اپنی ہوائی پرواز سے اس ناپاک زمین پر اترنا پڑے گا۔ ورنہ ان کی شاعری کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ (خطبات ص ۴۰)

کلام اور سیرت

کلام میں تو صرف یہی ہے کہ اسے پڑھ کر ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے یا اس کے اثر سے متاثر ہو کر لطف ملتا ہے، لیکن سیرت کی خوبی دوسروں کی اصلاح کرتی اور ان کو بناتی ہے۔ کلام کا لطف تو ممکن ہے کسی کو نہ آئے لیکن سیرت کے اثر سے بہت کم ہیں کہ متاثر نہ ہوں۔ اس میں ایک زبردست اخلاقی قوت ہے جو اصلاح کا بڑا ذریعہ ہے اور کلام و سیرت میں وہی فرق ہے جو قول و فعل میں ہوتا ہے۔ (مقدمات دوم ص ۳۸)

نظم اور نثر

مولیر کے ایک کیرکٹر کو یہ معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی تھی کہ وہ چالیس سال سے نثر بول رہا ہے

اور اسے خبر تک نہ ہوئی ، لیکن اگر زبان کے ارتقا کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان ہزاروں سال تک نظم میں باتیں کرتا رہا اور اسے خبر نہ ہوئی۔ اس کے آثار اب تک نثر میں موجود ہیں اور بغیر اس کے نثر وجود میں نہیں آسکتی۔ (خطبات ص ۱۹۱)

انسان ابتدا میں زیادہ تر جذبات اور جبلت کا تابع تھا۔ اب بھی جہاں کہیں تمدن نے اپنی پرچھائیں نہیں ڈالی وہاں لوگ جذبات کی پوٹ معلوم ہوتے ہیں۔ عقل دیر میں آتی ہے اور مشکل سے آتی ہے اور اس کا جذبات پر غالب آنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ جذبات کا اظہار نظم ہی میں خوب ہوتا ہے۔ انسان کا پہلا کلام گیت ہے۔ گانا اور ناچنا انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا ہے۔ فطرت میں ہر جگہ ناچ اور گانا نظر آتا ہے۔ موزونیت دونوں کی جان ہے اور انسان کے اولین جذبات بے تکلفی اور سادگی سے انہیں کے طفیل میں ظاہر ہوئے اور جب تک سائنس ان کو بالکل کچل کر اسے (انسان کو) مشین کا پتلا نہ بنادے یہ یونہی رہیں گے۔ (قدیم اردو ص ۲۱۸)

شوخی اور ظرافت ادب میں

شوخی اور ظرافت بڑی پر لطف چیز ہے اور کلام کا رتبہ اس سے بعض اوقات بہت بلند ہوجاتا ہے اور دلوں کے شگفتہ کرنے اور بعض خیالات کے ادا کرنے میں یہ ایک سحر کا کام کرتی ہے بشرطیکہ ایک حد تک اور مناسبت

سے ہو اور کوئی لطافت بھی پائی جاتی ہو۔ (مقدمات حصہ دوم ص ۱۷۰)

ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بار گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لئے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔ (چند ہم عصر ص ۲۴۹)

اسلوبِ بیان

نئے اسالیب

نئے اسلوب اور اظہار کے نئے ڈھنگ کوئی جرم نہیں، لیکن نئے ڈھنگ کیوں نا مقبول ہوتے ہیں؟ اس لیے نہیں کہ وہ نئے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان کے برتنے والے میں خامی ہے۔ اگر شاعر کے خیالات میں جدت، تازگی اور گہرائی ہے اور ان کا اظہار حسن اور سلیقے سے کر سکتا ہے تو نئے اسلوب ایک نہ ایک دن ضرور مقبول ہو کے رہیں گے۔
(ادبی تبصرے ص ۸۵)

انسان کا قلب ہی بجائے خود ایک عالم ہے جس میں ہزاروں کیفیات اور جذبات بستے ہیں اور ایک ذرا سے اشارہ پر اپنا کرشمہ دکھا جاتے ہیں۔ کیسا پرزور ہونا چاہئیے وہ قلم جو ان تمام کیفیات کو اس طرح بیان کرے کہ تصنع کا نام نہ ہو۔ (مقدمات اول ص ۱۸۸)

اسلوب کی سادگی

ہم کیوں لکھتے ہیں؟ اسی لیے تاکہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں، تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے اسی نسبت سے اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوگا۔ اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ تحریر آسان زبان میں ہو اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ اسے شوق سے

پڑھ سکیں، اگر مشکل زبان میں ہو تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہوگی ۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں، جنہیں قبول عام حاصل ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں یہ عزت انہیں کو ملی ہے جنہوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کیے ہیں ۔

ہم آسان کیوں نہیں لکھتے ؟ اور مشکل کیوں لکھتے ہیں ! آسان اس لیے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان نہیں اول تو لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو ، دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اس قدر صاف اور روشن ہو اور اس کا ہر پہلو اس قدر جچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے ۔ جب خیال خود ہمارے ذہن میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرز بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے ۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے ۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کون سا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے ۔ لفظ میں بڑی قوت ہے ۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا اثر کرتا ہے، بعض وقت اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی اُلجھن ہوتی ہے ۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے ، دوسرا آتا ہے اُسے بھی ہٹا دیتا ہے ، تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا ، آخر اسی رد و بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے

جیسے گھٹا میں سے چاند نکل آیا۔ جو اس گر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب ایچ پیچ اور هیر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے هیں، پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں هوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کرتا ھے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی هوئی ھے کہ بڑے اور پر شکوہ لفظوں میں زیادہ قوت هوتی ھے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی ضرورت هوتی ھے، لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ھے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لیے پر شکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ھے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور مشیخت جتانے کے لیے بھی، لیکن اثر اور دل نشینی کے لیے آسان اور چھوٹے لفظ هی کام آتے هیں بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت هوتی ھے۔ (خطبات ص ۵۲۵، ۵۲۶- ۵۲۷)

ایک ادیب کا قول ھے کہ ”ایک اعلیٰ درجے کے با کمال شخص اور ایک احمق میں صرف ایک هی چیز مشترک ھے اور وہ ھے سادگی۔“ ایسی سادہ زبان لکھنا جس میں سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی هو، صرف با کمال ادیب کا کام ھے۔ محض سیدھے سادھے لفظ جمع کر دینا اور سپاٹ، بے لطف، بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بد تر ھے۔ هر شخص کا طرز اور اسلوب بیان جدا هوتا ھے، ادب و شعر میں کوئی کسی کو مجبور نہیں کرسکتا کہ

یوں نہیں یوں لکھو، حکم سے یا فرمائش سے کسی کو سادہ لکھنا نہیں آسکتا۔ زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے مضمون یا مقتضائے حال کے مطابق جو الفاظ موزوں اور بر محل ہوں، استعمال کرے۔ (خطبات ص ۱۲۲-۱۲۳)

ہر زبان میں آسان لکھنے والے بھی ہوتے ہیں اور مشکل لکھنے والے بھی۔ ایک تو اپنا اپنا طرز بیان ہوتا ہے اور دوسرے مضمون کی نوعیت کا مسئلہ اور بھی ٹیڑھا ہے۔ سائنس، فلسفہ، شعر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں اشکال آہی جاتا ہے۔ البتہ بچوں، لڑکوں، لڑکیوں اور عام لوگوں کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں وہ ضرور آسان اور سلیس زبان میں ہونی چاہئیں۔ اس بارے میں لوگ الفاظ پر زور دیتے ہیں کہ غیر مانوس اور ثقیل لفظ نہ ہوں۔ اشکال غیر مانوس لفظوں سے اتنا نہیں پیدا ہوتا جتنا پیچیدہ اور مغلق بیان سے۔ اس سے زیادہ زور اس بات پر دینا چاہئیے کہ بیان سادہ اور سہل ہو۔ رہا لفظ، تو اس کا پرکھنے والا ادیب ہی ہوسکتا ہے۔ وہ ہر لفظ کی نبض پہچانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ کون سا لفظ کہاں آنا چاہئے۔ اس میں موقع و محل کو پہچاننا بڑی بات ہے، یہ انشا پردازی کا بڑا گر ہے۔ لفظ میں ایک جادو ہوتا ہے جو بے محل استعمال سے پھیکا پڑ جاتا ہے اور اچھا خاصا لفظ بے جان اور بے اثر ہوجاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ

ہماری آواز زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچے تو ہمیں ایسی زبان میں لکھنا یا بولنا چاہئے جسے زیادہ سے زیادہ اشخاص سمجھ سکیں۔ اور اگر ساتھ ہی آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر و تقریر میں اثر اور دل کشی بھی ہو تو اس کے لیے بڑی محنت، مشق اور مطالعے کی ضرورت ہے ورنہ نری سادہ زبان زیادہ کار آمد نہیں ہوسکتی۔ (خطبات ص ۵۳-۵۴-۵۵)

جب بچوں یا معمولی پڑھے لکھوں کے لیے کوئی کتاب یا قصے کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو بھی زبان سادہ رکھنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ ہماری عادت پر موقوف نہیں، دنیا کی سب زبانوں کا یہی حال ہے۔ مگر جب کوئی اچھی نظم لکھنی ہوتی ہے یا علمی یا ادبی بحث آپڑتی ہے تو سادہ زبان کا نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ محض زبان کا آسان ہونا کافی نہیں۔ اس میں جان، اثر اور لطف بھی ہونا چاہئیے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدی ہو۔ دوسرے ہر ایک کا طرز تحریر الگ ہوتا ہے۔ کسی کا کوئی رنگ ہے اور کسی کا کوئی ڈھنگ، یہ ہر ایک کے مزاج اور افتاد طبیعت پر منحصر ہے ہم کسی کو مجبور نہیں کرسکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو اگر مجبور کریں بھی تو ممکن نہیں، وہ نیا ڈھنگ تو کیا اختیار کرے گا اپنا بھی بھول جائے گا۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ جو آج کل چاروں طرف ''آسان آسان،، کا

پرچار کیا جارہا ہے مجھے تو یہ کچھ بے جا سا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں کہ جہاں چاہا اٹھایا رکھ دیا۔ اس کے گنوں کے پرکھنے والے مشاق ادیب ہی ہوسکتے ہیں۔ کسی اعلا درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھیے ہر لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔ اسے بدل کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے، ساری لطافت اور نزاکت خاک میں مل جائے گی۔ علاوہ اس کے آسان اور مشکل اضافی لفظ ہیں، یعنی ایک چیز جو مجھے مشکل معلوم ہوتی ہے دوسرا اسے آسان سمجھتا ہے، جسے میں آسان سمجھتا ہوں وہ دوسرے کے نزدیک مشکل ہے۔ اس سے آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہوسکتی۔ یہ ذوق کی بات ہے اور ادب میں یہی منزل بڑی کٹھن ہے۔ وہاں آسان اور مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا، وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ لفظ موقع اور محل کے مناسب ہے یا نہیں۔ اگر آسان لفظ بھی بے محل آگیا تو ایسا ہی برا ہے جیسا بے موقع مشکل لفظ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیان پیچیدہ اور الجھا ہوا نہ ہو۔ سادگی اور آسانی کے یہی ایک معنی ہوسکتے ہیں۔
(خطبات ص ۳۶۱-۳۶۲)

زبان ہی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ ہم اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ جسقدر ہم اپنے خیالات دوسروں تک پہنچائیں گے اسی قدر ہمارا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوگا۔ جو شخص اپنا کلام اور پیغام ہزاروں تک پہنچا سکتا ہے

وہ یقیناً بڑا ہے اور جو کروڑوں تک پہنچا سکتا ہے وہ اُس سے بھی بڑا شخص ہے اور جو تمام بنی نوع انسان تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے وہ سب سے بڑا انسان ہے۔ لیکن کلام لاکھوں کڑوڑوں انسانوں تک کس صورت سے پہنچ سکتا ہے؟ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ الفاظ سادہ اور دل نشین ہوں اور خیالات میں گنجلک نہ ہو۔ دل کی آواز سادہ ہوتی ہے۔ کلمۂ حق ہمیشہ سادہ ہوتا ہے جس کا جلوہ ہمیشہ سادگی ہی میں نمایاں اور دل کش ہوتا ہے۔ زبان سیکھو، پڑھو اور لکھو لیکن اس کے ساتھ دل اور صداقت بھی پیدا کرو۔ جہاں دل میں درد اور صداقت نہیں، وہاں آواز میں بھی درد اور صداقت نہیں ہوسکتی۔ (خطبات ص ۸۶-۸۷)

سادہ لکھنے کی ہدایت کرنا آسان ہے لیکن سادہ لکھنا نہایت دشوار ہے۔ لوگ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں لیکن یہ بہت غیر معمولی چیز ہے۔ یہ بات علاوہ فطری استعداد کے بڑی مشاقی، بڑے تجربے، بہت مطالعے اور بہت مشاہدے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ صرف کامل ادیب ہی اسے نبھا سکتے ہیں۔ سادہ لکھنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنی تحریر میں سادہ اور سہل لفظ جمع کر دیں اور کوئی مشکل لفظ نہ آنے دیں۔ سادگی کے ساتھ جب تک تحریر میں لطف، کشش اور اثر نہ ہو وہ ادب میں شمار نہیں ہوسکتی۔ ایک پھسپھسی، بے جان اور بے اثر تحریر کا لکھنا نہ لکھنے سے بدتر ہے۔ جب تک کلام میں

لکھنے والے کی روح شریک نہ ہو کلام مردہ ہوگا اور دلوں میں گھر نہیں کرسکتا ۔ اگر آپ کے کلام میں سادگی کے ساتھ صداقت، جدت، تازگی اور جوش ہے تو وہ آب رواں کی طرح موجیں مارتا ہوا بڑھتا ہوا چلا جائے گا اور اگر وہ دقیق الفاظ، پیچیدہ استعارات و تشبیہات اور تکلف و تصنع کے بوجھ سے دبا ہوا ہے تو بحر مردار کے پانی کی طرح ساکن، مردہ اور بے حس ہوگا ۔ زمانۂ حال کے ایک بہت بڑے ادیب نے خوب کہا ہے کہ ''سادگی اور صداقت توام اور حسن ان کی تیسری بہن ہے۔'' یہی وہ سادگی ہے جو سیدھی دل و دماغ میں جا بیٹھتی ہے ۔ یہی وہ سادگی ہے جو دلوں کو لبھاتی اور گرماتی اور خیالات میں روشنی پیدا کرتی ہے۔ دنیا کے وہ کامل اور اعلیٰ ادیب اور شاعر جن کا سکہ سارے عالم پر بیٹھا ہوا ہے ان کے قبول عام کا راز اسی میں ہے ۔ صدیاں گذر گئیں، جگ بیت گئے لیکن ان کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا ۔ (خطبات ص ۸۷-۸۸)

سادگی و پرکاری کمال صناعی ہے اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں، سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کردئے جائیں ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی ۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہئے ۔ یہ صرف با کمال ادیب کا کام ہے یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اس لئے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل

عبور ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرز بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دل کش ہوجاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کرسکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں، اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بے کار اور تضیع اوقات ہے۔ (چند ہم عصر ص ۲۸۷—۲۸۹)

خیال اور بیان

جب کوئی خیال دماغ میں صحیح اور صاف نہیں ہوتا تو بیان میں بھی صحت اور صفائی نہیں آتی اور ہزار عبارت آرائی کیجئے، دھندلاپن نہیں جاتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم خیال ادا تو کرتے ہیں مگر جو ہم چاہتے ہیں وہ بات پیدا نہیں ہوتی، اس لئے فقروں کے ردے پر ردے چڑھائے چلے جاتے ہیں اور پھر بھی بات نہیں بنتی۔ ہے کیا؟ ایک لفظ کی کمی ہے جو اس موقع پر آنا چاہئیے تھا اور وہ نہیں سوجھا .... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ہارکر نثری شاعری کرنے لگتے ہیں۔ یہ شیوہ ضعف ادبیت کی دلیل ہے۔ (مقدمۂ مقالات حالی حصہ اول ص ب)

جب آدمی کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں ہوتا تو وہ چیخ و پکار اور شور و غل سے کام لیتا ہے۔ یہی بعض انشا پرداز کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بہت بلند اور پرزور عبارت لکھتے ہیں۔ (ادبی تبصرے ص ۷۹)

ضبط اور اعتدال ایسا ہے جو بڑی مشکل سے نصیب ہوتا ہے اور صرف بڑے بڑے اساتذہ ہی اس پر قادر ہو سکتے ہیں ورنہ اکثر اچھے اچھے انشا پرداز اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر کہیں سے کہیں بھٹک کر نکل جاتے ہیں اور غیر متعلق باتیں کہنے لگتے ہیں اور بعض اوقات بجائے کچھ کہنے کے چیخنے اور چلانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو زیادہ چیخے چلائے گا اسی کی آواز زیادہ سنائی دے گی۔ (مقدمۂ مقالات حالی حصہ اول ص الف)

صنائع بدائع

صنائع بدائع ادب کا جز ہیں۔ یہ ایک فطری چیز ہے کلام کا حسن بڑھانے کے لئے نہیں بلکہ اکثر اوقات مفہوم کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن جب صنعت کے ساتھ تصنع اور تکلف آجاتا ہے اور سوچ سوچ کر اور کوشش کر کے صنائع کو داخل کیا جاتا ہے تو کلام بے لطف اور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے، شعر شعر نہیں رہتا ضلع جگت ہو جاتا ہے۔ (ماہنامہ ہم قلم جون ۱۹۶۱ء ص ۹)

عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی

عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات و واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو۔ (چند ہم عصر ص ۲۸۲)

تنقید و تحقیق

اور

دیگر اصنافِ ادب

تنقید و تحقیق

افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسیوں مسلک وجود میں آچکے ھیں ۔ مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، ماحولی، تاثراتی، نفسیاتی، وغیرہ وغیرہ ۔ اور اس زمانے میں فرائڈ اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ھے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رھیں گے ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے انکشافات کا بھی اثر پڑتا رھے گا ۔ افتاد طبع ، ماحول، تعلیم و تربیت و صحبت کی بناء پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ھوجاتا ھے اور جب اس میں غلو ھوتا ھے تو وھی مسلک یا مذھب بن جاتا ھے، اسی لیے تنقید کا کوئی مسلک جامع نہیں ۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیر اثر ایک طرف جھک جاتے ھیں اور دوسرے رخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ھیں یا بالکل نظر انداز کردیتے ھیں ۔ صحیح تنقید اس وقت ھوگی جب ادب کے ھر رخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا ۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی ، ماورائی، روحانی ، جذباتی کہتا ھے اور اسے ماضی پرستی یا روایت پرستی کا ملزم قرار دیتا ھے اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ

فرائڈ اور مارکس پرستی میں مادیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے اور اسکی تنقید بھی ادبی تنقید نہیں رہتی کچھ اور ہی چیز ہو جاتی ہے۔ بے شک ادب کا کام صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں، لیکن اس کا کام محض مادیت کا پرچار بھی نہیں ہے، یہ دونوں کا خادم ہے۔ کیا تنقید کے لیے لازم ہے کہ نقاد کسی خاص مسلک کا مقلد ہو؟

شے ایک ہی ہوتی ہے، لیکن اس کے دو رخ ہوتے ہیں، ایک باطن دوسرا ظاہر۔ ادب کا بھی ظاہر اور باطن ہے۔ ظاہر، اسلوب بیان اور الفاظ کا صحیح استعمال وغیرہ ہے۔ باطن، خیال یا موضوع، جو اصل مقصد ہے۔ خیال کیسا ہی اہم اور وقیع کیوں نہ ہو اس کے اظہار کا ذریعہ لا محالہ الفاظ یا زبان ہے۔ اور یہی ایک ذریعہ ہے جس کی بدولت ہم اپنا خیال دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ادب کے بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ حسن بیان ہی خیال میں دل کشی پیدا کر کے لوگوں کے دلوں میں اسے جاگزین کرتا ہے اور تحریک کا باعث ہوتا ہے اس میں شبہ نہیں۔ اصل غایت خیال ہے اور حسن بیان ذریعہ، لیکن طرز بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں، ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے۔ جسم کو روح سے اور روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے، اس لئے تنقید میں نقاد اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا

سالہا سال سے چلا آ رہا ہے، یہ بحث عبث ہے۔ عینیت ہو یا حقیقت نگاری زندگی سے بچنا محال ہے۔ یہ ہمارے پیچھے ایسی بری طرح پڑی ہے کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے، پیدائش کے وقت ہی سے دنیا کے حالات انسان پر اثر انداز ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔ آدمی ان سے کیوں کر اور کہاں تک نجات پا سکتا ہے۔ روسی نقاد بلنسکی نے خوب بات کہی ہے :- ”عوام بغیر غور و فکر کے زندگی بسر کرتے ہیں اور بری طرح رہتے ہیں۔ لیکن زندگی میں پڑے بغیر غور و فکر کرنا کیا اس سے بہتر ہے ؟“

حقیقت یہ ہے کہ زندگی بسر کرنا اور اُسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض و غایت ہے، جس کی تکمیل تنقید کی بدولت ہو سکتی ہے۔ تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے، اسے ذاتی اظہار کے قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے۔ ایک طرف وہ سنت قدیم پر غیر ضروری شیفتگی سے بچاتی ہے اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے یعنی بریک کا کام دیتی ہے، پڑھنے والوں کے لیے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی اور محرک بن کر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لئے تنقید لازم ہے۔“ (مقدمہ ”اردو تنقید کا ارتقا۔“)

تنقید صحیح ذوق کے لیے لازم ہے لیکن ایک نقاد کے لیے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہے وسیع معلومات ، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔ صحیح تنقید مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لیے مفید ہے۔
(خطبات ص ۱۴)

تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کرسکتا ہو جس کا تجربہ وسیع ، مطالعہ گہرا اور نظر دوربین ہو ، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو ، جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور دوسروں کے دل نشین کرسکتا ہو۔ (تنقیدات ص ۹۹)

تنقید جس قدر عام ہے اسی قدر مشکل ہے۔ جس طرح یہ ہمیشہ سے چلی آتی ہے اسی طرح ہمیشہ تک چلی جائے گی۔ اس کے مختلف مذاهب اور فرقے اور اس کے متعلق مختلف خیالات اور متضاد رائیں ہیں۔ (تنقیدات ص ۹۹)

اپنے زمانے کے رواج کے مطابق شعر پڑھ کر مزہ لینا نسبتاً آسان ہے لیکن تحقیق کا رستہ بہت دشوار اور کٹھن ہے۔ (تنقیدات ص ۸۸)

ادبی اور علمی معاملات میں ایسی تحقیق جو خطا و سہو سے بھی بری ہو، شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ (تنقیدات ص ۱۲۰)

غلطی ، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ادب کا کامل ذوق سلیم ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا۔ غلطی ترقی کی مانع نہیں ہے بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے۔ (مقدمات دوم ص ۲۰۹)

ڈرامانگاری

ادب نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ہنستوں کو رلانا اور روتوں کو ہنسا دینا، دشمن کو دوست، دوست کو دشمن بنانا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ بگڑی بات کا سنوارنا اور صاف سیدھی بات کا بگاڑ دینا اس کا ایک کھیل ہے۔ ایک ذرا سی بات میں ہزاروں کا سر کٹوا دینا اور لاکھوں کا خون بہا دینا اور ایک کلمہ میں پشتینی مخالفوں اور جانی دشمنوں میں جھٹ پٹ صلح کرا دینا اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔ وہ تلواروں کا مقابلہ زبان سے اور نیزوں کا مقابلہ قلم سے کرتا ہے اور اپنے زور سے جدھر چاہتا ہے دنیا کو کھینچ لے جاتا ہے۔ لیکن اس میں بھی قسمیں ہیں اور درجے، نظم ہے، نثر ہے اور ان کی بھی بیسیوں قسمیں۔ اور اس پر اپنی اپنی طبیعت اور اپنا اپنا دماغ۔ لیکن ان سب میں موثر اور کارگر اگر کوئی ہے تو ڈراما ہے جو دنیا کی مختلف حالتوں اور انسان کی مختلف کیفیتوں کو اس خوبی سے دکھاتا ہے کہ نقل میں اصل کا مزہ آجاتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں وہ مزہ نہیں آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بالطبع نقل کرنے

اور نقل دیکھنے سے خوش ہوتا ہے۔ مثلاً وہی شے یا بات جو روزانہ دیکھنے یا سننے میں آتی ہے جب ہم کسی تھیٹر میں اس کی نقل ہوتے دیکھتے ہیں تو جتنی وہ اصل کے مطابق ہوتی ہے اسی قدر اس میں لطف آتا ہے۔ غرض رنج والم، عیش وعشرت، نکبت و اقبال، کمال و زوال سب کی تصویریں سامنے کھنچ جاتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ واقعات ہمارے سامنے گزر رہے ہیں۔ جو لوگ ڈراما کے کرنے والے ہیں ان کی حالت، صورت، بول چال، لباس سب کے سب ایک عجیب کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جن باتوں کو ہم اپنی زبان یا صرف قلم اور فصاحت کے زور سے بار بار جتانا چاہتے ہیں وہ سب مرحلے ڈراما کے ایک ایکٹ میں طے ہو جاتے ہیں۔ جہاں انسان کی اور تمام قوتیں قاصر ہیں وہاں اس کا جلوہ برق لہر کا کام کرتا ہے۔ عالم، جاہل، بچے، بوڑھے سب پر اس کا اثر جادو کا سا ہوتا ہے۔ نصیحت بہت ناگوار اور تلخ ہوتی ہے لیکن یہاں آکر ایسی شیریں اور پر لطف ہوجاتی ہے کہ جو اس سے بھاگتے تھے وہ خوشی خوشی اس کے سننے کے لئے دوڑے آتے ہیں۔ کوئی واعظ، کوئی فصیح مقرر یا لکچرار اپنے کلام اور فصاحت سے اتنا اثر نہیں ڈال سکتا جتنا ڈرامے کے چند ایکٹ، خصوصاً جب واقعات ایسے حیرت افزا اور جوش انگیز ہوں جن سے قوموں کی قوموں میں انقلاب پیدا ہوگیا ہو، خیالات کی ترتیب بدل گئی ہو، دلوں میں امنگ اور امنگوں میں اپج پیدا ہوگئی ہو اور سونے

پر سہاگہ یہ کہ ان واقعات کا لکھنے والا ایسا ہو جس کے قلم میں زور اور تاثیر ہے اور جسے نظم و نثر میں یکساں کمال ہے۔ (مقدمات اول ص ۱۸۶-۱۸۷)

ڈراما اصناف ادب میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ رکھتا ہے۔ عمدہ ڈراما ادبی کمال، تخیل کی رفعت اور انسانی فطرت کے مطالعے کی بہترین مثال ہے اور انسانی دل و دماغ اور اخلاق پر اثر ڈالنے کے لئے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ (ادبی تبصرے ص ۲۷)

پند و موعظت اور لکچر، مجلسوں کی رودادیں اور پمفلٹ وہ کام نہیں کرسکتے جو ایک ڈراما کر دکھاتا ہے بشرطیکہ اس کا لکھنے والا صاحب نظر اور ادیب ہو اور اس فن کو سمجھتا ہو۔ (ادبی تبصرے ص ۲۸)

سوانح نگاری

ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں صحرا بھی ہو دریا بھی ہو آسان ہے لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشیاء تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اسے عکس ریز (ایکس ریز) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے۔ (مقدمات دوم ص ۱۹۶)

یہ بھی اردو علم ادب کی ترقی کی علامت ہے کہ مشاہیر ملک و ملت کے حالات پر بہت سی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ اب تک زیادہ تر ان قدما کے حالات لکھے گئے ہیں جو بلحاظ تقدس و دیگر کار ہائے نمایاں پہلے ہی سے ہیرو سمجھے جاتے ہیں اور جن کے سوانح قدیم عربی کتب میں جابجا پائے جاتے ہیں یا ان کے متعلق مستقل کتابیں موجود ہیں اور ان کی عزت و وقعت صد ہا سال سے ہمارے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ ان مولفین کو یہ آسانی ہوتی ہے کہ مواد تیار ملتا ہے البتہ مختلف کتابوں سے حالات جمع کرنے اور ترتیب

میں رد و بدل کر کے اردو زبان میں پیش کرنے کی زحمت ضرور گوارا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ان کتابوں کی ترتیب عمدہ اور زبان فصیح ہوتی ہے تو ان کا مقبول ہونا کچھ مشکل نہیں ہوتا کیوں کہ وہ لوگ پہلے ہی سے مقبول خاص و عام ہیں۔ مگر ہمعصر مشاہیر کے حالات کا لکھنا اس کے مقابلہ میں بہت کٹھن ہے۔ اول تو تمام حالات کا جمع کرنا اور مختلف واقعات اور بیانات کی چھان بین کے بعد کیرکٹر کی صحیح تصویر کھینچنا ہی ایک ایسی دشواری ہے جسے اسی کا جی جانتا ہے جسکو کبھی اس قسم کے کام کرنے کا تجربہ ہوا ہے۔ دوسرے صدہا شخص ایسے زندہ موجود ہیں جو اس نامور شخص کے خیالات سے آگاہ ہیں اور انہوں نے اس کو مختلف حالات میں دیکھا ہے اور اس کے متعلق خاص رائے رکھتے ہیں۔ سوانح نگار جانتا ہے کہ اس کی کتاب موافق و مخالف ہر دو گروہ کے ہاتھ میں جانے والی ہے اور اس لیے طعن و تشنیع کی زد سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ (مقدمات اول ص ۱۹۳-۱۹۴)

بڑے آدمی کی بڑائی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے تعلقات، گرد و پیش کے حالات اور قومی و ملکی معاملات سے تانے بانے کی طرح ایسے جکڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس کی ذات کو ان سے جدا کرنا قریب قریب ناممکن کے ہوتا ہے، ورنہ بڑا آدمی کچھ بڑا نہیں رہتا۔ اس لیے سوانح نگار کے فرایض میں داخل ہے کہ وہ اس شخص کے کیرکٹر کو ان تمام گرد و پیش کے واقعات و حالات کی روشنی

میں دکھائے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اختلاف رائے ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے ہمعصر مشاہیر کے متعلق بعض غلط فہمیاں عام طور پر پھیل جاتی ہیں۔ سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو صحیح اور سچے واقعات اور اس کے وسیع تعلقات اور اصلی خیالات کے اظہار سے جن پر عام لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی رفع کرے اور اپنی رائے اور صحیح قیاس کے اظہار سے دریغ نہ کرے اور محض مخالفوں کے ڈر سے یا ان کی خوشی کے لیے عامیانہ مقبولیت حاصل کرنے کی خاطر پہلو نہ بچائے۔ انصاف پسند لوگ سوانح نگار کی اس محنت کی داد دیں گے اور اس کے ممنون ہوں گے، اگرچہ بدبیں لوگوں کو اس سے تکلیف ضرور ہوگی۔ نرے خالی خولی ذاتی حالات کا بیان کردینا کافی نہیں ہے اور کوئی سوانح نگار اس طور پر اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ جس قدر جو شخص بڑا ہوگا اسی قدر سوانح نگار کو اپنی رائے اور قیاس سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ وسعت تعلقات سے اصل حقیقت کے سمجھنے میں نہ صرف الجھن پیدا ہوتی ہے بلکہ غلطی واقع ہو جاتی ہے اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ گرد و پیش کے حالات کا اثر اس پر اور اس کا اثر ان حالات پر کیا پڑا۔ قطع نظر غلطی و صحت کے اس کی نیت کا اندازہ کرنا پڑیگا، اسکے اصلی اور اندرونی خیالات کو دیکھنا پڑیگا، اس کے برتاؤ، اس کے طرز کلام و طرز تحریر،

اس کی عام روش اور رجحان کی تلاش کرنی پڑیگی۔ غرض سوانح نگار اس تمام چھان بین، کرید، جستجو و تلاش کے بعد صحیح قیاس اور رائے قائم کرسکے گا اور اس سے اس کی اپنی نیز لوگوں کی بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی۔ اگر سوانح نگار ایسا شخص ہو جو اس بڑے شخص کی خوبیوں کا قدرداں نہیں تو کیا وہ اس اہم فرض کو ادا کرسکتا ہے؟ (مقدمات۔ اول۔ ص ۱۹۴)

عظیم انسانوں کا مطالعہ

تصویر جس قدر بڑی شان دار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خد و خال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنہوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کار نمایاں کئے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں، ان میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کئے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں، ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریا کار بھی، خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ رائے کے جانچنے کے لئے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں

کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ (چند ہم عصر ص ۲۳۳)

مشاہیر کے حالات اور درس اخلاق

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے...... اخلاق سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کر دے، زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے، یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے، ''مرنج و مرنجاں ہو۔'' اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط، تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلا ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے، اپنے بھائیوں کے دکھ درد کو اپنا درد سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

می تواں قطب زماں شد می تواں شد غوث وقت
ہرچہ خواہی می توانی شد بجز انسان شدن!
چیست انسانی تپیدن از تپ ہمسائگان
از سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس !
در شبستان تنگ دل از محنت زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی، ہماری تعلیم گاہیں دکانیں ہیں جن میں دساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمایشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے اور ذہن تک ہوتی ہے اخلاق صرف و نحو، منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ان بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنہوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ ان کی قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ (چند ہم عصر ص ۳۳۴-۳۳۶)

ایسے بزرگوں کے تذکرے جنہوں نے اپنے تن من دھن کو تحصیل علم، تزکیۂ نفس یا رضا جوئی باری

تعالی میں وقف کردیا تھا اس زمانے کے لیے بہت کار آمد اور مفید ثابت ہوں گے ۔ پند و نصائح اور اخلاق کتب اس قدر مفید نہیں ہوتیں جس قدر ان لوگوں کے تذکرے جو خود پاکیزہ اخلاق کے نمونے تھے ۔ وہ صرف باتیں ہیں اور یہ کام، وہ صرف مردہ الفاظ ہیں اور یہ زندہ اعمال ۔ لہذا اس کے اور اس کے اثر میں بہت بڑا فرق ہے۔ (مقدمات ۔ اول ۔ ص ۲۰۰)

آپ بیتی

آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی (تاریخ) میں کہاں ۔ مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے، آپ بیتی لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا ۔ بعض اوقات اس کے ایک بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے ۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے اور کچھ کیا بھی ہے اپنی بیتی آپ لکھ جایا کرے تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہوں۔ (مقدمات۔ اول ۔ ص ۳۲۲)

★★★

مکتوب نگاری

خانگی خطوط میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دل چسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی در اندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے، جہاں اندیشہ لازم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روز نامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روز نامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں، جنہیں نہ انشا کی صنعت مسخ کر سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل و دماغ کھول کے رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت، ہر خیال اور ہر تمنا جیتی

جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔ (مقدمات دوم۔ ص ۹۸)

ادب میں سینکڑوں دلکشیاں ہیں، اس کی بے شمار راہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوط میں جو جادو ہے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ صرف سادگی ہی ایک ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانے میں زوال نہیں، بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں۔ یہ ہمارے خمیر میں ہے۔ یہ ہماری فطرت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ بولے اور یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول کو اٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری ہر تصنیف و تالیف، ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے، غیروں کے لیے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی، اس لیے مصلحت وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے، تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح

طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ نہ دوسروں سے چوکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے۔ اس وقت نہ اُسے خوف لازم ہوتا ہے اور نہ نکتہ چینی کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔ ان خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال جس طرح اُس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے، نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کے رکھ دیتا ہے۔ (ادبی تبصرے ص ۷۶-۷۷)

لغت نگاری

ایک کامل لغت میں ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہوگا کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ اس کے کون کون سے معنی متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں، اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معانی پیدا ہوئے ہیں۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی اصل کی تحقیق کرنی ہوگی۔ یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے، اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنے تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔ لفظ کی تاریخی حالت معلوم کرنے کے لیے اصل یا اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مماثل اور ہم علاقہ لفاظ کے صحیح تعلقات اور ہم شکل مگر مختلف‌الاصل الفاظ کی تحقیق اور ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔

ایسی لغت کا مرتب کرنا نہایت دشوار ہے۔ جب تک کافی سرمایہ، معقول عملہ اور بہت سے معاونین نہ ہوں اس کام کا انجام پانا ممکن نہیں۔ یہ نہایت محنت طلب اور سالہا سال کا کام ہے۔ تاہم اگر کوشش اور محنت کی جائے تو بعض ایسے ضروری امور کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جن کا تعلق لفظ کی اصل اور معانی سے ہے۔

ہماری لغات میں عموماً لفظ کی تعریف نہیں دی جاتی بلکہ اکثر ہر لفظ کے سامنے اس کے کئی کئی مترادف لکھ دیے جاتے ہیں۔ ان مترادف الفاظ کے علاوہ معنیٔ مطلوبہ کے کئی کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک ناواقف شخص کے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر مترادف کہاں تک اس لفظ کا ہم معنی ہے یا سیاق و سباق کی کی رو سے ان کے معانی میں سے کونسا ٹھیک بیٹھتا ہے۔ اور جو شخص مترادف کے معنے نہیں سمجھتا وہ اس لفظ کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھے گا۔ محض مترادف لکھ دینے سے صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اس کی تشریح و توضیح ضروری ہے۔

ہمارے لغت نویس اس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ لغت میں جو لفظ ہو مستند اور فصیح ہو اور کوئی ٹکسال باہر نہ ہو۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ لغت نویس الفاظ کا جامع اور مورخ ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہے، لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا

یہ مطلب ہوا کہ وہ صرف اپنے زمانے کے وہی الفاظ درج کرے جو ادبی اعتبار سے مسلم ہوں اور ان کے معانی اور استعمال بتائے - مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ حق نہیں ہے کہ لفظوں کا انتخاب کرے اور نہ اسے اس بات کے فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ فلاں لفظ اچھا ہے اور فلاں برا - اس کا کام اچھے برے سب لفظوں کا لینا ہے خواہ اس کی رائے میں ذوق کے خلاف ہوں یا موافق - لغت میں سب لفظ ہونے چاہئیں خواہ وہ رائج ہوں یا متروک اور ان کے تمام معانی اور استعمال درج کرنے لازم ہیں -

الفاظ کی کئی قسمیں ہیں - ایک تو عام لفظ ہیں جن میں ادبی اور بول چال کے لفظ آجاتے ہیں - ایک دوسری قسم عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی ہے - عامیانہ اور سوقیانہ میں بھی فرق کرنا ضروری ہے، پھر عورتوں کے الفاظ اور محاورے ہیں - ان کے علاوہ پیشہ وروں اور علوم و فنون کے الفاظ و اصطلاحات ہیں - بعض اوقات ان کی تقسیم میں مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ فلاں لفظ کو کس قسم کے تحت میں رکھا جائے، کیونکہ بعض قسمیں ایسی ملتی جلتی ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا آسان نہیں ہوتا - بہت سے لفظ ایسے ہیں جو ایک زمانے میں عورتوں سے مخصوص تھے اور اب عام ادب میں داخل ہوگئے ہیں اور یہی عامیانہ اور پیشہ وروں کے الفاظ اور محاوروں کا حال ہے - ہماری زبان میں بہت سے ایسے لفظ پائے جاتے ہیں جو ایک وقت میں صرف

بعض پیشوں سے مختص تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ عام الفاظ میں شریک ہوکر ادب کی زینت کا باعث ہوگئے - ایسے الفاظ خواہ وہ عورتوں کے ہوں یا پیشہ وروں کے ادائے مطلب میں خاص حسن پیدا کردیتے ہیں - ان کے سوا اجنبی زبانوں کے الفاظ ہیں جو اردو زبان میں داخل ہوچکے ہیں یا داخل ہو رہے ہیں - ان کا شمار بھی عام الفاظ میں ہونا چاہئیے - پھر اعلام ہیں جن کا اگرچہ ایک عام لغت سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن کچھ ان میں ایسے ہیں کہ جن سے ادب میں جگہ جگہ مڈبھیڑ ہوتی ہے - لہذا لغت نویس کو انکا بھی خیال رکھنا پڑے گا - لیکن اسے اس کا فیصلہ کرنا بھی ضروری ہوگا کہ کون سے داخل کیے جائیں اور کون سے ترک کئے جائیں - بعض اعلام ایسے ہیں کہ وہ ادب میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ان کا جدا کرنا ممکن نہیں ، یہاں تک کہ ان سے دوسرے اجزائے کلام مثلاً صفات وغیرہ بن گئے ہیں - جیسے دقیانوسی، عباسی، اورنگ زیبی وغیرہ - ان کا لکھنا لازم ہے - ان کے علاوہ اور بھی ایسے ہیں جن کا جاننا ادیب کو ضروری ہے کیونکہ ادب میں ان سے متعلق تلمیحات و استعارات جا بہ جا آتے ہیں - ان کو بھی لغت میں داخل کرنا ہوگا - لیکن ان سے متعلق صرف ایسی ہی معلومات درج کی جائیں جو بہت ضروری ہیں، مستقل مضامین نہ ہوں -

متروک الفاظ کا معاملہ اور بھی ٹیڑھا ہے - زندہ زبان ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے - آج جو زبان بولی جاتی ہے

سو برس پہلے ایسی نہ تھی ۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مسلسل مگر آہستہ آہستہ تحلیل و تجدید کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ پرانے لفظ متروک ہوتے جاتے اور مرتے جاتے ہیں ۔ نئے لفظ گھستے چلے آتے ہیں ۔ لفظ کو موت اچانک نہیں آتی، یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا ہے ۔ کوئی شخص کسی لفظ کی موت کی صحیح تاریخ اور وقت نہیں بتاسکتا "لفظ"، یعنے وہ لفظ جو ہم بولتے یا استعمال کرتے ہیں، متروک نہیں ہوتے ۔ یہ ہمارے بزرگوں کے لفظ ہیں جو نشانۂ اجل ہوتے ہیں ۔ ہم ایک لفظ کا استعمال ترک کر دیتے ہیں لیکن وہ مر نہیں جاتا ۔ اس کی یاد باقی رہتی ہے اور اس کے استعمال کا امکان بھی باقی رہتا ہے ۔ مردہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اس کا کوئی بولنے والا نہیں رہتا ۔ اس لیے لغت نویس کو یہاں مشکل کا سامنا ہوتا ہے ۔ آسے بہت سے ایسے لفظ ملیں گے جو مشتبہ ہیں اور جن کی نسبت یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ آیا وہ اب بھی زبان کا جز ہیں یا نہیں ۔ بعض کے نزدیک وہ زندہ ہیں اور بعض کے نزدیک مردہ ۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے ہیں کہ لغت میں داخل ہونے کے مدعی ہیں ۔ اگرچہ وہ بعض کی زبان یا قلم پر جاری ہیں تاہم وہ فصیح نہیں خیال کیے جاتے اور بعض ثقہ حضرات تو انہیں سرے کے لفظ ہی نہین مانتے ۔ ایک مستند لغت مین متروک الفاظ کا داخل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ قدیم اساتذہ کے کلام سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ اگر کسی لغت میں ان الفاظ کے مفہوم

ومعانی درج نہ ہوں تو اساتذہ کے کلام سمجھنے میں بڑی دشواری ہوگی اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا یہ دشواری بڑھتی جائے گی۔

اگر ہم الفاظ کو متروک اور رائج میں تقسیم کرتے ہیں تو ہمیں وہ تمام الفاظ لینے چاہئیں جو زبان کی پیدائش سے اب تک ہر زمانے میں مروج رہے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ لغت میں زبان کے پیدا ہونے کے وقت سے دم تحریر تک تمام الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ نا قابل عمل بلکہ نا ممکن ہے۔ اگر یہ اہتمام کیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تمام علوم و فنون مثلاً کیمیا، طبعیات، فلکیات، حیاتیات، نباتیات، قانون، طب، دینیات، فلسفہ، نفسیات، ریاضی، موسیقی، تجارت وغیرہ نیز تمام پیشوں کی اصطلاحات و الفاظ اور مختلف بولیوں اور صوبائی الفاظ درج کرنے ہونگے۔ ایسی صورت میں لغت دفتر پریشاں ہو جائے گی اور عام بول چال کے اور ادبی الفاظ اس انبار میں دب کر رہ جائیں گے۔ اگر صرف عام مستعمل لفظ ہی لیے جائیں تو بھی غیر ممکن نہیں تو نہایت دشوار ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ابتدائے زبان کی کتابیں یا تحریریں اگر تھیں بھی تو نا پید ہیں۔ اردوئے قدیم میں گجراتی یا گجری اور دکنی شامل ہیں۔ ان کے ہمیں گنتی کے کچھ نسخے ملتے ہیں۔ یہ قلمی نسخے جس حالت میں ہیں وہ معلوم ہے اور کاتبوں کی عنایت سے وہ جیسے کچھ مسخ ہوئے ہیں وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ پھر اس زبان سے اور زبان کے صحیح تلفظ سے کامل واقفیت

مفقود ۔ پھر کثرت سے ایسے لفظ ہیں جن کی اشکال صرف نحوی یا صرفی اختلاف کی وجہ سے ہے ۔ اس لیے ان کا داخل لغت کرنا بے سود ۔ لہذا ان مجبوریوں سے لغت کو مکمل بنانے کے لیے یہ ضرور ہوگا کہ کسی خاص زمانے سے اس کا آغاز کیا جائے اور اُس وقت سے لے کر اس وقت تک کے تمام لفظ داخل کیے جائیں ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ لفظ کی تحقیق کی خاطر اس کے ما قبل زمانے میں اس کا سراغ نہ لگایا جائے ۔ لفظ کے تاریخی ارتقا کے لیے ہمیں جستجو کرنی پڑے گی کہ اب تک جو تحریری سامان ہمیں دستیاب ہوا ہے اُس میں اول یہ لفظ کب استعمال ہوا اور بعد میں اُس کے معانی اور شکل و صورت میں کیا تغیر واقع ہوا ۔

اس تمام مسئلے کے حل کی ایک صورت یہ نکالی گئی ہے کہ ہم اپنی لغت میں ولی سے لے کر اس وقت تک کے تمام الفاظ داخل کرلیں ، اور ولی سے پہلے کے ادب کے الفاظ کی، جسے ہم قدیم اردو کہتے ہیں، الگ لغت تیار کی جائے ۔ اس طرح لغت کا یہ کام مکمل اور جامع ہوجائے گا اور ہماری لغات میں جو کمی پائی جاتی ہے وہ پوری ہوجائے گی ۔

اب رہے علوم و فنون، تو ان کے الفاظ اسی حد تک داخل کیے جائیں جن کی عام ادب میں ضرورت پڑتی ہے یا زبان میں استعمال ہوسکتے ہیں یا وہ جدید علمی الفاظ جو اب اردو میں داخل ہوگئے ہیں ۔ ایسے الفاظ کا داخل

کرنا مناسب نہ ہوگا جو تشریح کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئیں اور جنہیں صرف اس علم کے ماہر ہی سمجھ سکیں کیونکہ عام زبان کی لغت کسی خاص علم یا فن کی لغت نہیں ہے۔

ہماری اردو لغات میں علوم و فنون تو ایک طرف عام پیشوں اور صنعت و دستکاری تک کے معروف لفظ بھی نہیں ملتے۔ غالباً یہ ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں۔ شعرا جو ہماری زبان کے ٹکسالی اور ادب کی سند خیال کیے جاتے ہیں، جب ان کے دیوانوں میں ان کا گذر نہیں تو ہماری لغات میں کیوں آنے لگے، حالانکہ ہماری زبان میں ان کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے اور بہت اچھے اچھے اور معقول لفظ اور اصطلاحیں موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ لفظ روز بروز مٹتے جاتے ہیں۔ ایک تو کلوں کے رواج نے پیشہ وروں اور صناعوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں، ملکی صنعتیں مٹتی جاتی ہیں اور صناع اپنے شریف پیشے چھوڑ چھوڑ کر گھٹیا مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ دوسرے جو لوگ کاریگروں اور مزدوروں سے کام لینے والے ہیں ان کی تعلیم انگریزی زبان میں ہوئی ہے، ہندوستان میں ہوئی ہو یا انگستان یا امریکہ میں، وہ اپنے ہاں کے لفظ تو جانتے نہیں، اس لیے ”اپنے“ لفظ (جو انگریزی کتابوں میں پڑھے ہیں) بولتے اور لکھتے ہیں اور کاریگر اور مزدور بھی ”صاحب“ کے سمجھانے یا اس کی تقلید میں اور اکثر از راہ فخر انگریزی لفظ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح

دیسی لفظ پسپا ہوتے جاتے اور انگریزی دخیل ہوتے جاتے ہیں۔ ان بھولے بسرے لفظوں میں جو کس مپرسی کے عالم میں ہیں ایسی اچھی اصطلاحیں اور محاورے موجود ہیں کہ غیر زبان کے ان لفظوں سے جو ان کی جگہ لے رہے ہیں بدرجہا بہتر، سلیس اور شیریں ہیں۔ اور اگر ان کو رواج دیا جائے تو یقین ہے کہ اپنے دوسرے بھائی بندوں کی طرح ادب اردو کی رونق بڑھائیں گے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ شمس‌العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کے ترجمے میں Horse-shoe arch کا ترجمہ نعل اسپ محراب کیا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ ہے اصطلاح نہیں۔ دلی کے پرانے استاد معمار سے پوچھا تو اس نے کہا اسے "گھڑنال" کہتے ہیں۔ بات وہی ہے مگر دیکھیے کتنا فرق ہے۔ گھڑنال میں اصطلاحی شان ہے۔

ایک پیشہ وروں اور صناعوں کے الفاظ اور اصطلاحیں ہی نہیں، بلکہ ایسی موٹی موٹی چیزیں جیسے بر صغیر پاک و ہند کی زبانوں اور بولیوں، معروف پھلوں، درختوں اور اقوام قبیلوں کے نام تک ہماری لغات میں نہیں ملتے۔ جدید اردو لغت نویس کا فرض ہے کہ وہ ان تمام کمیوں اور فروگزاشتوں کو پورا کرے۔

ایک بحث اوکسفورڈ ڈکشنری والوں نے یہ پیش کی ہے کہ ڈکشنری ان سائی کلوپی ڈیا نہیں ہونی چاہئے۔ ان سائی کلوپی ڈیا میں اشیا کا بیان ہوتا ہے، ڈکشنری

الفاظ کی تشریح کرتی ہے۔ ان سائی کلوپی ڈیا میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اشیا کے الفاظ کس زبان کے ہیں، ان کی اصل کیا ہے اور اس کے مختلف استعمال کیا ہیں۔ ڈکشنری میں لفظ کی اصل، اس کے مفہوم، مختلف استعمالات اور اس کے تمام اجزا سے بحث ہوتی ہے۔ مثلاً ان سائی کلوپی ڈیا کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ فوج، کھاٹ، البتہ جیسے الفاظ کا ذکر کرے یا ان کی تاریخ و تشریح بیان کرے۔ اسی طرح لغت میں جلد سازی کی معلومات یا ہوائی جہاز کی ساخت و تاریخ وغیرہ کا بیان بے محل ہوگا۔ اوکسفورڈ ڈکشنری انگریزوں کی محنت، تقسیم کار، تلاش و ہمت کا عجیب کارنامہ ہے۔ اس کے مرتب کرنے والوں نے اس اصول کی بڑی سختی سے پابندی کی ہے، یہاں تک کہ اتنی ضخیم ڈکشنری میں ایک علم بھی نہیں آیا ہے۔ انہوں نے تمام اعلام کو خواہ تاریخی ہوں یا جغرافی بالکل نظر انداز کردیا ہے۔ ہاں اگر کسی علم سے کوئی صفت یا کوئی اور جز کلام بن گیا ہے تو اسے لکھ دیا ہے۔ اُن کے خیال میں ایسی لغت جس میں ان دونوں امور کی پابندی کی گئی ہے ایک دوغلی یا مخلوط قسم کی کتاب ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس اصول کی پابندی اس سختی کے ساتھ لغت کے حق میں مضر ہوتی ہے۔ اَن سائی کلوپی ڈیا اور لغات میں حدود قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تشریح کامل طور پر اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ان اشیا کا جن کا وہ مفہوم ادا کرتے

ہیں کچھ نہ کچھ ذکر نہ کیا جائے۔ علاوہ اس کے اشیاء کا بیان اسما کی تعریف میں مضمر ہوتا ہے۔ اس لیے ڈکشنری کے صحیح طور پر مرتب کرنے کے لیے ان دونوں طریقوں کا امتزاج خاص کر اردو لغت میں ضروری ہے، کیونکہ ہماری زبان میں نہ تو ان سائی کلو پی ڈیائیں ہیں اور نہ خاص قسم کی لغات۔ اگر اس کام کو احتیاط اور صحیح طریقے سے انجام دیا جائے تو ڈکشنری ڈکشنری ہی رہے گی، ان سائی کلو پی ڈیا نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہوگا کہ اشیاء کے بیان میں صرف وہیں تک کام لیا جائے جہاں تک اس کے لفظ کے استعمال اور مفہوم کے متعین کرنے میں مدد ملے اور معروف اور ادبی اعلام کا، تاریخی ہوں یا جغرافی، وہیں تک ذکر کیا جائے جو ضروری عام معلومات کی حد تک ہوں۔ ان کے کارناموں، سیرت اور جزئیات وغیرہ کے بیان کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

اردو لغات میں جدید الفاظ کا مسئلہ بھی قابل غور ہے۔ ایک ایسی ادبی زبان میں جیسی کہ اردو ہے، جس میں روایات ایک گونہ مستقل اور مسلم ہیں اور جہاں ہر موقع پر نظیر اور سند کا سوال پیش ہوتا ہے اور ہر لفظ اور محاورے کے لیے سند میں کسی مستند شاعر کا شعر طلب کیا جاتا ہے، جہاں ایسے استفسارات معمولی ہیں کہ تم نے یہ لفظ کہاں دیکھا؟ کیا کسی مسلم الثبوت استاد کی سند پیش کر سکتے ہو؟ کیا کسی لغت میں ہے؟ وہاں کسی نئے لفظ کا بنانا محال نہیں تو دشوار

ضرور ہے ۔ یہاں ہر نئے لفظ کو پیدا ہوتے ہی فنا کا دھڑکا لگا رہتا ہے ۔ وہ خود اپنی ہستی سے کھسیاتا اور شرمندہ معلوم ہوتا ہے ۔ قوسین یا واوین یا نیچے اوپر کے خط یا جلی خط جو اس کے نئے ہونے کی علامت ہیں خود اس کے وجود کی معذرت کرتی ہیں۔ لیکن ایک زندہ اور بڑھتی ہوئی زبان میں نئے خیالات کے ادا کرنے کے لیے الفاظ بنانا ناگزیر ہے۔ حال کے زمانے میں بہت سے نئے لفظ بنے اور بنتے جاتے ہیں اور آیندہ بنیں گے۔ وقتی ضرورت کے لئے زبان کے فطری اور نحوی اصول پر یا نقل کے طور پر یا پہلے سے موجود الفاظ جس ترکیب سے بنے ہیں، اس کے تتبع میں نئے لفظ پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض دیر سویر عام گفتگو میں میں اور گفتگو سے اخبارات میں آ پہنچتے ہیں اور اخبارات سے انشا اور ادب میں داخل ہو جاتے ہیں ۔ اردو کا لغت نویس ان الفاظ کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جو لفظ عام طور پر استعمال میں آ گئے ہیں اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس مفہوم کے لئے جو وہ ادا کرتے ہیں دوسرے لفظ نہیں ہیں، ان کا لغت میں داخل کرنا لازم ہے۔

ایک اور ضروری بات جو لغت نویس کو پیش نظر رکھنی چاہیے یہ ہے کہ ہر لفظ اور محاورے کے لئے سند پیش کرے۔ محض لغت نویس کی تعریف و تشریح کافی نہیں اور نہ وہ مستند ہو سکتی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی

ہے کہ لغت نویس لفظ کی تعریف اور مفہوم کے سمجھانے میں کتنی ہی کوشش کرے لفظ کا صحیح مفہوم مثال اور استعمال ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ لفظ کے مختلف استعمالوں میں نازک فرق ہوں۔ لیکن سند مستند ادیب کی ہو۔ بعض لغت نویس لفظ کے خاص مفہوم کو پیش نظر رکھ کر بلا امتیاز اسناد پیش کر دیتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کوئی جملہ یا شعر ایسا مل جائے جس سے کسی لفظ کے تاریخی یا خاص مفہوم کا سراغ لگتا ہے تو بغیر اس خیال کے کہ وہ کسی مسلم الثبوت استاد کا کلام ہے یا نہیں، سند پیش کر دینا چاہیے۔ ورنہ ہر صورت میں، جہاں تک ممکن ہو، ہر سند میں مستند مصنف یا استاد کا کلام پیش کرنا چاہیے۔ ایک مفہوم یا استعمال کے لئے بلا وجہ بہت سی مثالیں نہ لکھی جائیں۔ سند ایسی ہونی چاہیے جس سے لفظ کا مفہوم اور استعمال صحیح صحیح اور واضح طور پر معلوم ہوجائے۔ مثال ایسی نہ لکھی جائے جو مشتبہ ہو، یعنی مفہوم یا استعمال قطعی طور پر صاف صاف ظاہر نہ ہوتا ہو۔

ایک اور امر جس کی طرف ہمارے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی وہ صلات ہیں۔ یعنی کس مصدر یا لفظ کے ساتھ کونسا صلہ آتا ہے۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں انہیں اس میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ بعض اوقات خود اہل زبان کو بعض الفاظ کے صلوں میں شبہ ہو جاتا ہے یا ان کے استعمال میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ اردو لغت

میں تمام ضروری صلات کا درج کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اس سے کہا یا اُس کو کہا - اُس سے متعلق یا اُس کے متعلق - کسی کے منہ آنا یا کسی پر منہ آنا - ان میں کون سا صحیح ہے یا دونوں صحیح ہیں تو اُن کے مفہوم میں کیا فرق ہے۔ یا کون سا غلط ہے اور کون سا صحیح - اسی طرح وہ اُس سے خفا ہے اور وہ اُس پر خفا ہوا - کسی چیز سے انکار کرنا اور کسی چیز کا انکار کرنا ، ان کے معانی میں کیا فرق ہے۔ غرض جہاں ضرورت ہو الفاظ کے صلات کا بتانا ضروری ہے۔ بعض اوقات ایک ہی لفظ کے مختلف صلات کے آنے سے معانی میں بھی فرق آجاتا ہے۔ اُسے بھی ظاہر کردینا چاہیے -

لغت میں الفاظ کے صحیح تلفظ کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری لغات میں اس باب میں بہت بے توجہی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے پڑھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اور غلط تلفظ رائج ہو جاتا ہے۔ قدیم طریقہ اچھا تھا - اس میں تلفظ عبارت میں ظاہر کردیا جاتا تھا اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہو سکتا تھا - مثلاً کرشمہ بہ فتح ک و کسر ر و بہ سکون ش بہ فتح م اور سکون ہ -

لیکن اس میں طوالت تھی اور پڑھنے میں الجھن ہوتی تھی - اب متروک ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اعراب کا

اور ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں اُن کا تعین کر دیا جائے اور انہیں لغت کے شروع میں مثالوں کے ساتھ لکھ دیا جائے اور لغت میں اُن کے مطابق احتیاط سے لفظ کے حروف پر یہ اعراب لگادیے جائیں۔ جن الفاظ کے تلفظ میں غلطی کا احتمال ہو ان کو قوسین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا الگ الگ حروف میں اعراب کے ساتھ لکھ دینا چاہیے، مثلاً ”چے ٹک“۔ بعض اچھے ادیبوں اور شاعروں کو اس کا تلفظ ”چ ٹ ے ک“ کرتے سنا ہے۔ یا مثلاً ”جھیلنا“ (جھے ل نا) کو بعض اشخاص ”جھی ل نا“ بول جاتے ہیں۔

اردو میں اب تک جو لغت کی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں اکثر یہ ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے نقل کرلی ہے اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی میر حسن اور باغ و بہار (قصہ چہار درویش) جیسی مقبول و معروف کتابوں کے بھی پورے لفظ کسی لغت میں نہیں ملتے۔ جدید لغات کو تلاش اور جستجو کی بے حد ضرورت ہے۔ مثلاً ہمیں وہ تمام مسالا جمع کرنا چاہیے جس پر الفاظ اور اُن کی تعریف اور تاریخ اور ان کے مختلف استعمال اور نازک فروق کی بنیاد ہو، اور یہ سامان زبان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ادب کے مطالعہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس غرض

کے لیے سارے اردو ادب کو چھاننا اور کھنگالنا پڑے گا۔ ورنہ محض دوسری لغات سے الفاظ جمع کر کے نئی لغت ترتیب دیدینا کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ جدید لغت کے مقاصد اور وسعت کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ تحقیق کا کام زیادہ وسیع باقاعدہ اور زیادہ صحیح ہو۔ مختصر یہ کہ جہاں تک ممکن ہو ہر عہد کی زبان اور ہر قسم کی زبان کا باقاعدہ اور باریکی سے مطالعہ کیا جائے تاکہ زبان کے ہر لفظ اور ہر معنی اور الفاظ کے تمام مفہوم اور شکلیں جو ہر زمانے میں مروج تھیں معلوم ہوسکیں۔ اور ان کی سند کے لیے کافی اقتباسات احتیاط اور صحت اور تصدیق کے ساتھ اس طرح دیے جائیں کہ وہ پیش نظر تمام امور پر حاوی ہوں۔ کتابوں کے علاوہ خاص رسالوں اور اخباروں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

یہ کام نہایت دشوار اور کٹھن ہے اور کسی ایک شخص کے بس کا نہیں۔ اس قسم کے کام کے لیے متعدد اڈیٹروں، سب اڈیٹروں اور بہت سے معاونوں کی ضرورت ہوگی۔ نیز ایک اعلا درجے کے ایسے کتب خانے کا ہونا لازم ہوگا جس میں اردو ادب کا کامل ذخیرہ، اردو فارسی عربی کی مختلف قسم کی تمام لغات' انگریزی اور دوسری زبانوں کی ڈکشنریاں، کتب استناد و لسانیات' مختلف علوم

و فنون کی کتابیں اور لغات، اور تحقیق زبان و الفاظ کے لیے تاریخ کی کتابیں، سفر نامے وغیرہ وغیرہ موجود ہو معاون اور کام کرنے والے خاص قابلیت و ذوق اور مختلف حیثیت کے ہوں۔ اس تمام سامان اور عملے کے لیے کثیر رقم درکار ہوگی۔

تراجم کی اہمیت

خیالات کے بدلنے، علمی ذوق پیدا کرنے، نئے اسلوب بیان سمجھانے اور زبان کی ترقی میں ترجمہ کا بڑا دخل ہے۔ ترجمے کا کام بہت کٹھن ہے۔ تالیف و تصنیف سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ تالیف و تصنیف میں اظہار خیال کی آزادی ہوتی ہے۔ ترجمے میں قدم قدم پر پابندی کا سامنا ہوتا ہے۔ اصل مصنف کے طرز فکر، اسلوب بیان، اظہار خیال کے انداز اور خاص الفاظ کے معانی کی نزاکت کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اور بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے تاکہ اصل مصنف کا مفہوم اپنے الفاظ اور محاورے میں اس طور سے ادا ہوجائے کہ مصنف کے منشا کے سمجھنے اور بیان کے انداز اور قوت میں فرق نہ آنے پائے۔

تین قسم کی کتابوں کے ترجمے میں خاص طور پر دشواری ہوتی ہے، آسمانی صحیفوں کے ترجمے میں کہ جس میں لفظ کے ذرا سے فرق سے مفہوم کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔ دوسرے قدما کی امہات کتب (کلاسکس) کے ترجمہ میں جن کا ایک وصف ایجاز ہوتا ہے۔ قدیم اساتذہ و حکما علمی مسائل کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ

سے بعد کے علما کو ان کتابوں کی شروح اور حواشی لکھنے پڑے۔ آج کل کے اہل علم مسائل کے بیان میں اس قدر طوالت سے کام لیتے ہیں کہ ان کے خلاصے لکھنے پڑتے ہیں۔ ترجمہ میں اس ایجاز کو قائم رکھ کر اپنی زبان کے مناسب الفاظ میں مصنف کے صحیح مفہوم کو ادا کرنا آسان کام نہیں)۔ تیسرے فلسفہ اور سائنس کی امہات کتب کا ترجمہ جن کے سمجھنے کے لئے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے، فلسفہ و سائنس کے پیچیدہ اور گہرے مسائل آدمی خود تو غور و فکر اور محنت کے بعد سمجھ سکتا ہے، لیکن ان مسائل کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے دوسروں کو سمجھانا نہایت مشکل ہے۔ اس میں بڑے صبر اور محنت کی ضرورت ہے۔
(رسالہ قومی زبان—۱۶-اکتوبر ۱۹۵۸ء)

جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کر کے تنہا اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ نہیں سکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوام عالم سے بے نیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقی پائے۔ جس طرح ہوا کے جھونکوں اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھرے رہتے ہیں جہاں انسان کی دسترس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اڑ کر پہنچتے ہیں۔ جس طرح یونان کا اثر رومہ اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا، جس طرح عرب نے عجم کو اپنا فیض پہنچایا، جس طرح اسلام نے یورپ میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر

علم کی روشنی پہنچائی اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں - یہ قانون عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہے گا -

,, دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے،،

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے، اس لئے کہ جب قوم میں جدت اور اپج نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری، کم مایہ اور ادنا ہوں گی۔ اس وقت قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ سے دنیا کی اعلا درجے کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں - یہی ترجمے خیالات مین تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سجھائیں گے - ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے۔ (مقدمات حصہ دوم ص ۲۰۲-۲۰۱)

ترجمے کا کمال یہ ہے کہ مصنف کے مفہوم کو اپنی زبان اور محاورے میں اس طرح ڈھال کر ادا کیا جائے کہ گنجلک پیدا نہ ہو۔ اصل خیال کی قوت میں فرق نہ آئے اور یہ معلوم ہو کہ کتاب ہماری ہی زبان میں لکھی گئی تھی - یہ بات ترجموں میں مفقود ہے۔ اچھے ترجمے ادب

کا جزو بن جاتے ہیں - اور انہیں اصل تصنیف کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے- برے ترجمے زبان و ادب اور پڑھنے والوں کے دماغ اور ان کے طرز تحریر پر بہت مضر اثر ڈالتے ہیں - (خطبات ص ۵۲۹)

ترجمے کو بعض اوقات حقارت سے دیکھا جاتا ہے- لیکن ترجمہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس میں اسی قدر جاں کاہی اور سر دردی کرنی پڑتی ہے جتنی نئی تالیف یا تصنیف میں - ترجمے میں وہی کامیاب ہوسکتا ہے جو مضمون پر حاوی ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں میں کامل دسترس رکھتا ہو، ادب کی نزاکتوں سے واقف ہو اور اصل مصنف کے صحیح مفہوم کو اپنی زبان میں اسی قوت سے بیان کر سکے - یہ آسان کام نہیں اور ہر ایک کا کام نہیں - ترجموں سے زبانوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے- یہی نہیں کہ ہمارے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ خود زبان بھی اس سے متمتع ہوتی ہے- ایک اعلیٰ درجے کی تصنیف کا عمدہ ترجمہ بہت سی معمولی تصنیفوں سے کہیں بڑھ کر مفید ہوتا ہے، وہ ادب کا جز بھی ہوجاتا ہے- (خطبات ص ۱۶-۱۷)

ہندوستان کی اور خاص کر مسلمانوں کی اس وقت جیسی کچھ حالت ہے اسے مد نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ علمی بیداری کا پہلا دور ترجمہ ہی ہے- اگر غیر زبانوں کی علمی اور اعلا تصانیف کے ترجمے ہو جائیں تو آیندہ دور کی تالیف و تصنیف کے لئے بیش بہا سرمایہ اور پیش خیمہ ہو گا - (چند ہم عصر ص ۷۵)

علم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اتنا دشوار نہیں۔ اس میں صرف اس علم کا بخوبی جاننا لازم ہے۔ لیکن ادب کی خصوصاً تخلیق ادب کی اعلیٰ کتابوں کا ترجمہ نہایت دشوار اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اس میں معانی کے ایسے باریک اور نازک فرق ہوتے ہیں اور خیال میں ایسی لطافت اور ابہام ہوتا ہے جسے صرف ایک دقیق نظر نقاد یا نکتہ رس ادیب ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے نادر روزگار جواہر پاروں کے ترجمے کے لئے منجملہ دوسری قابلیتوں کے ذوق ادب کا ہونا ضروری ہے۔ کچھ عرصہ قبل ان کتب کے ترجمے کے لئے قابل مترجموں کا دستیاب ہونا مشکل تھا لیکن اب ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جن میں یہ صلاحیتیں موجود ہیں اور اصل زبانوں سے ترجمہ کرسکتے ہیں۔ لہذا ایسی حالت میں اس سے غفلت کرنا زبان کے حق مین ظلم ہوگا۔

(رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۲ء)

لِسانیات

زبان

قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں کہ ان پر ہماری زندگی کا انحصار ہے، وہ نہ ہوں تو ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے، جیسے ہوا، پانی، تنفس وغیرہ۔ لیکن عام یا بہ افراط ہونے سے ہمیں ان کی کچھ قدر نہیں ہوتی، یہی حال زبان کا ہے، بچپن سے لے کر مرتے دم تک یہ ہمارے ساتھ ہے اور روز مرہ کے استعمال کی وجہ سے وہ ایک معمولی چیز ہوگئی ہے اور ہم اس کی قدر نہیں کرتے جو کرنی چاہئے۔ ورنہ دیکھا جائے تو زبان کا انسان کی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اس کے نتائج اور اثرات نہایت عجیب اور دور رس ہیں۔ یہ ایک معمولی بات ہے جسے ہر شخص جانتا ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اگرچہ جانوروں کے بھی زبان (جیب) ہے اور بعض کی ہم سے بہت بڑی ہوتی ہے لیکن ان میں قوت گویائی نہیں۔ یہ خاص انسان کی امتیازی شان ہے۔ یہ محض اس کے خیالات کے اظہار کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس کے خیالات کے بنانے اور سنوارنے کا بھی آلہ ہے۔ وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں دخیل اور کارفرما ہے۔ اگر ہم اس کے تحفظ و ترقی

کے لیے جد و جہد کریں، جان لڑا دیں تو یہ ہمارا فرض ہے۔ اور اس فرض سے غفلت کسی مذہب و ملت میں روا نہیں۔ (خطبات ص ۷۵-۷۶)

زبان کی نشو و نما

زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اسے ایجاد کر سکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے، اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ (مقدمات عبدالحق - حصہ دوم - ص ۱۱۹)

انسان کتنی بھی ترقی کر جائے، ترقی و اصلاح کی پھر بھی گنجائش باقی رہتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز بنتی بگڑتی، ڈھلتی اور بڑھتی ہے۔ زبان بنتی بھی ہے اور بنائی بھی جاتی ہے۔ جس طرح ہم حیات کو جکڑ بند نہیں کر سکتے اسی طرح زبان کو بھی مقید نہیں کر سکتے۔ یہ اس کے لیے موت ہے۔ آیندہ کی ترقی اور موجودہ اصلاح پر ہمیں ہمیشہ نظر رکھنی چاہئے۔ (خطبات ص ۳۰۲)

حال ہی میں ایک مورخ نے جس نے دنیا کے تمدن پر بہت معقول کتاب لکھی ہے، مسئلۂ تمدن پر بڑی گہری نظر ڈالی ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد آخر میں ساری کتاب کا نچوڑ اس ایک چھوٹے سے جملے میں ادا کر دیا ہے (Man makes himself) یعنی آدمی

خود اپنے آپ کو بناتا ہے۔ یہی میں زبان کے متعلق کہتا ہوں کہ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم جیسا چاہیں گے ویسی بنے گی اور گزشتہ زمانے میں بھی جیسا ہم نے چاہا ویسی بنی۔ لیکن زبان کے بنانے میں یہ نکتہ یاد رکھیے کہ ملک کی عام اور مقبول زبان وہی ہوسکتی ہے جسے زیادہ تعداد سمجھے۔ اگر آپ اس اصول کو پیش نظر نہ رکھیں گے تو آپ کی زبان سکڑتے سکڑتے ایک محدود حلقے میں بند ہو کے رہ جائے گی۔ (خطبات ص ۹۰-۹۱)

زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں ان سے جدا نہیں ہوسکتی۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت ان کی ہم دم ہے۔ ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہے۔ زبان کا حشر وہی ہوگا جو اس کے بولنے والوں کا ہوگا۔ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ گذشتہ زمانے میں جیسا ہم نے اسے بنانا چاہا ویسی ہی بنی اور آیندہ بھی جیسا اسے بنانا چاہیں گے ویسی ہی بنے گی۔ اس کے بگڑنے میں ہمارا بگڑنا اور اس کے بننے میں ہمارا بننا ہے۔ (خطبات ص ۲۴۹)

زبان انسانی زندگی، ضرورت اور خواہشات سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی سازش یا چند لوگوں کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ (خطبات ص ۲۲۱-۲۲۲)

اس میں شک نہیں کہ زبانوں کے بننے اور ترقی پانے میں انسان کے ارادے اور خواہش کا بھی دخل ہے، لیکن اس

سے زیادہ اس کی ساخت میں قدرت کا ہاتھ ہے اور قدرت کے قاعدے عجیب و غریب ہیں جن پر انسان کو پوری دست رس حاصل نہیں ۔ (خطبات ص ۲۲۲)

زبان کو انسانی ضرورت نے پیدا کیا اور زبان اور اس کے ادب کا ارتقا زمانے کی ضروریات اور حالات و افکار کے تابع رہا اور آیندہ بھی رہے گا۔ مذہب کے نام سے یا سیاسیات کے پردے میں اس کی اشاعت کا پراپیگنڈا کرنا خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ نفاق کی آگ ملک میں بھڑک رہی ہے دانش مندانہ فعل نہیں ہے۔
(خطبات ص ۵۵)

زبان کا مزاج

جس طرح اشیا ، ادویہ اور انسانوں کا مزاج ہوتا ہے اسی طرح زبان کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے جو اس کی فطرت ہے۔ خلاف مزاج دوا ہو یا بات ہمیشہ ناگوار یا مضر ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی بات کہی یا لکھی جائے جو زبان کے مزاج یا اس کی فطرت کے خلاف ہو تو وہ بھی ناگوار ہوتی ہے اور اس کا کہنے یا لکھنے یا والا تعلیم یافتہ اور شایستہ نہیں سمجھا جاتا ۔ (خطبات ص ۲۵۹)

زبان ـــ ایک مقدس میراث

زبان صرف اظہار خیال کا آلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جز ہے۔ ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہے وہ اپنی بساط کے موافق اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان

ضرور چھوڑتا جاتا ہے۔ اس میں ہمارے تمدن و شایستگی، خیالات و جذبات، تجربات اور مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے ہر لفظ ایک زندہ شے ہے جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت و مشقت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے۔ ہم نا خلف ہوں گے اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی و فروغ میں پوری کوشش نہ کی۔

(خطبات ص ۴۴)

زبان اور زندگی

زبان صرف بول چال ہی کے لیے نہیں ہوتی۔ انسان محض بولنے اور بڑبڑانے کی کل نہیں ہے۔ زندگی کا پھیلاؤ دور دور تک ہے اور اس کے شعبے اسی قدر وسیع ہیں جس قدر کہ کائنات۔ زبان زندگی کا نہایت مفید اور اہم جز ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ اس کا لگاؤ اس قدر گہرا ہے کہ انسانی تمدن اور تہذیب کی ترقی جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں، اس میں بہت کچھ اس کا دخل پایا جاتا ہے۔ اس لیے اختیار کرنے کے قابل وہی زبان ہو سکتی ہے جو تہذیب و تمدن کی ممد ہو اور ان تمام افعال و اعمال کے انجام دینے میں کار آمد ہو سکے جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے۔ اگر وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور حالات زمانہ کے مطابق انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تو

ایک مقامی بولی ہوگی اور ملک کی مستند زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ (خطبات ص ۱۸۴-۱۸۵)

زبان اور انسانی ترقی

کسی حکیم کا قول ہے کہ جس چیز کو ہم ہر وقت دیکھتے رہتے ہیں اسے کبھی نہیں دیکھتے، یہی نہیں بلکہ اس کی قدر بھی نہیں کرتے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ ہم صبح سے شام تک اسے بولتے اور اس میں بات چیت کرتے رہتے ہیں لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو کبھی اس پر غور کرتے ہوں کہ یہ کیا چیز ہے اور اس میں کیسے کیسے گن بھرے ہوئے ہیں۔ .... اسے معمولی چیز نہ سمجھئے یہ ایک زبردست قوت ہے، اس کی پشت پر ایک نہایت مستحکم فصیل اور قلعہ ہے۔ وہ مستحکم فصیل اور قلعہ تہذیب و تمدن ہیں جن پر ہماری معاشرت اور ہماری سیاست، ہمارے مذہب اور ہماری ترقی کا دار و مدار ہے۔ اگر ہم ابتدا سے اب تک زبان کے ارتقا کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ انسانی ترقی کا راز بہت کچھ زبان میں پنہاں ہے، علم بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کا سہارا زبان پر ہے۔ (خطبات ص ۱۴۵)

زبان کا مذہب

زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ اس کی کوئی ذات اور قوم ہوتی ہے اور نہ کوئی وطن ہوتا ہے۔ جو کوئی اس کی تحصیل میں محنت کرتا ہے، اسے بولتا ہے اور صحت

اور فصاحت سے لکھتا ہے اسی کی زبان ہے اور وہی زبان دان اور اہل زبان ہے۔ (خطبات ص ۳۴۶)

قومی زبان

قومی زبان کے معنی ہی قومیت ہیں۔ اس کی قوت میں قوم کی قوت اور اس کی زندگی میں قوم کی زندگی ہے۔ (خطبات ص ۵۲۲)

قومی زبان کے لئے چند شرائط ہیں :—

(۱) یہ کہ وہ زبان دیسی ہو بدیسی نہ ہو۔
(۲) یہ کہ وہ کسی خاص فرقے یا رقبے تک محدود نہ ہو۔
(۳) یہ کہ وہ ملک یا مملکت کے مختلف علاقوں میں دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ لکھی یا سمجھی اور بولی جاتی ہو۔
(۴) ہماری قومی تہذیب (کلچر) اور تمدن (سوی لائی زے شن) اور روایات کی حامل ہو۔
(۵) یہ کہ وہ ہر قسم کے جذبات اور خیالات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔
(۶) یہ کہ وہ ادنا سے اعلا مدارج تک ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہو۔
(۷) یہ کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے

(پاکستان کی قومی و سرکاری زبان کا مسئلہ صفحہ ۲)

مقامی یا مادری زبان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور ہونی چاہئے، لیکن اس کے علاوہ ایک اور زبان بھی ہے جس کا درجہ مادری یا مقامی زبان سے بڑھ کر ہے اور وہ قومی زبان ہے ۔ مقامی بولی ایک خاص رقبے میں محدود ہوتی ہے اس لیے اس کا اثر بھی محدود ہوتا ہے۔ قومی زبان کی حدود زیادہ وسیع ہوتی ہیں اس لیے اس کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوتا ہے ۔ مقامی بولی صرف ایک مقام کی ہے ۔ قومی زبان ساری قوم کی ہے۔ قومی زبان کے ذریعے قوم کا ہر فرد اپنی آواز ساری قوم تک پہنچا سکتا ہے۔ مقامی بولی میں یہ قوت اور دم کہاں ؟ قومی زبان پوری قوم کے خصائص اور اس کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مقامی بولی صرف ایک جزو کی نمایندگی کرتی ہے اور بس ۔ قومی زبان قوم کے شیرازے کو مضبوط کرتی اور اسے منتشر ہونے سے بچاتی ہے اور قومیت کے ولولے کو زندہ اور تازہ رکھتی ہے۔ اگر اس مسئلے کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کی تہ تک پہنچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومیت اور زبان ایک ہیں، جدا جدا نہیں ۔ (خطبات ص ۳۳۲)

زبان اور قومی تہذیب

زبان کا زندگی میں بڑا دخل ہے۔ سیاست اور معاشرت اس سے جدا نہیں ہوسکتی ۔ تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ جب کسی قوم نے کسی دوسری قوم کو بہ زور شمشیر مغلوب کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس قوم کی زبان کو دبانا چاہا ہے کیوں کہ زبان قومی تہذیب اور اتحاد

کا بڑا کار گر عنصر ہے۔ (خطبات ص ۲۰۷)

قومی تہذیب کی عمارت زبان کی بنیادوں پر چنی جاتی ہے۔ (خطبات ص ۳۳۰)

زبان اور قومیت

زبان قومیت کے لیے ایسی ہی لازم ہے جیسے جسم کے لیے روح۔ قومیت کی تکمیل بغیر زبان کے نہیں ہوسکتی۔ (خطبات ص ۳۷۱)

زبان ایک بڑی قوت ہے اور قومیت اور تہذیب کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالف سب سے پہلے اس پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے مٹانے یا کم زور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان والے اگر اس راز سے واقف ہیں تو انہیں اس کے بچانے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ (خطبات ص ۲۱۱)

حیوانات میں بولنے اور بات چیت کرنے، زبان کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی صلاحیت صرف انسانوں کو عطا کی گئی ہے۔ زبان کی نشو و نما اور اس کی ترقی انسان کا عظیم‌الشان کارنامہ ہے۔ زبان کو انسانی تہذیب اور قومی قوام بنانے میں بہت بڑا دخل ہے۔ کم لوگ ہیں جو اس کی قدر و قیمت اور دور رس اثرات کو کماحقہ سمجھتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں اُسے عمل میں لاکر زبان کو اس درجے تک پہنچائیں جس کی وہ مستحق ہے۔ ادب کی

ترقی بہت قابل قدر ہے، لیکن زبان کو تہذیبی اور قومی حیثیت دینا دوسری چیز ہے۔ اگر اس مسئلے کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کی تہ تک پہنچا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان اور قومیت جدا نہیں۔ (خطبات ص ۵۳۲)

موجودہ زمانے اور حالات ھی میں نہیں بلکہ ھر زمانے میں انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں زبان نے بڑا کام کیا ھے، بلکہ بہت کچھ اسی پر دارو مدار رہا ھے۔ اگر گہری اور باریک نظر سے دیکھا جائے تو زبان کا مسئلہ قومیت کا مسئلہ ھے۔ (خطبات ص ۴۹۳)

زبان اور قومی ترقی

من جملہ ان اسباب کے جو قومی ترقی کا موجب ہوتے ھیں ایک بڑا سبب زبان کی تکمیل ھے۔ جس قدر جو قوم زیادہ ترقی یافتہ ھے اسی قدر اس کی زبان وسیع اور اس میں نازک خیالات اور علمی مطالب ادا کرنے کی زیادہ صلاحیت ھوتی ھے اور جس قدر جس قوم کی زبان محدود ھوتی ھے اسی قدر تہذیب و شایستگی بلکہ انسانیت میں اس کا درجہ کم ھوتا ھے۔ علمائے فلسفہ و لسانیات نے اعتراف کیا ھے کہ زبان خیال اور خیال زبان ھے اور ایک مدت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ھیں کہ انسانی دماغ کے صحیح تاریخی ارتقا کا علم زبان کی تاریخ کے مطالعے سے ھو سکتا ھے۔ الفاظ ھمیں سوچنے میں ویسی ھی مدد دیتے ھیں جیسے آنکھیں دیکھنے میں۔ اس لیے زبان کی ترقی درحقیقت عقل

کی ترقی، قومیت کی ترقی اور انسانیت کی ترقی ہے۔
(خطبات ص ۳۲۷ - ۳۲۸)

زبان اور قومی اتحاد

قومیت کے لیے یک رنگی کی، یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی ضروت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنادیتی ہے۔ (خطبات ص ۳۳۷)

زبان اور معاشرت

زبان بلا شبہ ایک معاشرتی ضرورت ہے۔ یہی اس کی تخلیق کا باعث ہوئی اور وہ اس کی زندگی کا ایسا جزو ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ وہ انسان سے الگ کوئی شے نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں سے وابستہ ہے جو اسے بولتے اور اس میں فکر کرتے ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے۔ زبان کی ترقی و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔ اسے وقتی سیاسیات کا راگ دینا سوتے ہوئے فتنے کو جگانا ہے۔ کیا سیاسی کانگرسوں اور سبھاؤں کے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک تہذیبی اور ذوقی معاملات پر ہاتھ نہ ڈالیں جب تک وہ قومیت کی کوئی صورت قائم نہ کرلیں۔ (خطبات ص ۵۰-۵۱)

زبان کی مخالفت

اس کو کبھی نہیں بھولنا چاہئیے کہ زبان خواہ کیسی ہی حقیر ہو، بولنے والوں کی زندگی سے اندر اور باہر ایسی لپٹی ہوتی ہے کہ وہ اس کا جز و لاینفک ہو جاتی ہے۔ زبان کی مخالفت بولنے والوں کی مخالفت ہے کیوں کہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں یعنی سیاست، معاشرت، تہذیب و تمدن کا سرمایہ اسی میں محفوظ ہے۔ زبان کا جانا زندگی کا جانا ہے۔ زبان کے لئے دنیا میں بڑے بڑے فساد اور بڑی بڑی جنگیں ہوئی ہیں، میدان جنگ میں اور اس سے باہر بھی۔ (خطبات ص ۲۲٦)

زبان کی محبت

ہر شخص کو اور ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے ہر جائز ذریعے کو استعمال کرے ور جہاں تک اس کی قدرت میں ہو، اس کی بہتری کے لئے کوشش کرے، لیکن کسی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان کی محبت یا جنون میں دوسری زبانوں کی تخریب کے درپے ہو۔ (خطبات ص ٥٦)

دنیا کی کوئی زبان نقص سے خالی نہیں۔ بعض زبانیں ہماری زبان سے بھی زیادہ بے قاعدہ، پیچیدہ اور دشوار ہیں لیکن دشواری کی وجہ سے کوئی اپنی زبان ترک کرکے دوسری زبان اختیار نہیں کرلیتا۔ وہ ہمارے اعضا و قویٰ کی طرح ہماری زندگی کا جزو ہے۔ جس طرح ہم دیدہ و دانستہ اپنے اعضا و قویٰ کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتے اسی طرح ہم اپنی زبان کو بھی اپنے سے جدا نہیں کرسکتے۔ (خطبات ص ۸۸)

عوام کی زبان

عوام کی زبان مثل قلب کے ہے جس سے تمام اعضا کو خون پہنچتا رہتا ہے اور ان کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ جب تک زبان کو عوام کی بولی سے مدد ملتی رہتی ہے اور وہ عوام کی بولی کا ساتھ دیتی رہتی ہے وہ زندہ اور چونچال رہتی ہے اور جس وقت سے اس کا تعلق عوام کی بولی سے منقطع ہو جاتا ہے تو اسی وقت سے اس پر مردنی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ (خطبات ص ۱۱۸)

زبان بندی

زبان کا مسئلہ معمولی نہیں۔ اس پر ہاتھ ڈالنا بہت خطرناک ہے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جہاں کہیں ایسا کیا گیا وہاں صرف ناکامی ہی نہیں اٹھانی پڑی بلکہ اس کے ساتھ بہت سی بلائیں اور آفتیں نازل ہوئیں اور انقلاب رونما ہوئے اور باوجود شدید مظالم اور عذابوں کے زبان بندی اور نظر بندی اور قانونی شکنجوں کے، ظالم مظلوموں کی اور زبردست زیردستوں کی زبانوں کو نہ مٹا سکے۔ برخلاف اس کے یہ ظلم اور عذاب اور سختیاں ان زبانوں کی ترقی کا باعث ہوئیں۔ (خطبات ص ۲۸۰)

ایک زبان

جس قوم کی کوئی ایک زبان نہیں وہ قوم نہیں اور جس ملک کی کوئی ایک زبان نہیں وہ مملکت نہیں۔
(خطبات ص ۳۳۸)

زبان دان اور اہل زبان

زبان ذات پات، قومیت، وطنیت سے بری ہے، جو اسے بولتا ہے اسی کی زبان ہے جو زیادہ صحت اور فصاحت کے ساتھ لکھتا بولتا ہے وہی زیادہ تر زبان دان اور اہل زبان کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں نہ کسی صوبے کی تخصیص ہے اور نہ کسی قوم اور نسل کی۔ (خطبات ص ۲۰)

کتابی زبان

جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں وہ زندہ زبان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل زبان یہی ہے اور یہی رہے گی۔ (ادبی تبصرے ص ۸۰)

زندہ اور مردہ زبان میں فرق

عام یا عامیانہ بول چال کو حقارت سے دیکھنا ایک عالمانہ خود پسندی اور بے تہی کی علامت ہے۔ یہی بول زبان کا سرچشمۂ قوت ہے جس سے وہ ہر وقت غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہے، زبان کو عام انسانی معاشرت اور حالات سے دوش بدوش رہنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں لازم ہے کہ وہ عوام کی بول چال سے فیض حاصل کرتی رہے، ورنہ وہ مردہ ہو جائے گی۔ ہندوستان کی اکثر زبانوں کا یہی حشر ہوا۔ جب نحویوں نے اپنے قواعد و ضوابط کی جکڑ بند سے انہیں مقید کرنا شروع کیا اور وہ کتابوں میں محدود ہو گئیں تو اسی وقت سے ان میں انحطاط پیدا ہونے لگا اور کچھ دنوں میں مردہ ہو کے رہ گئیں۔ عام

بول چال زندہ زبان کے لیے بمنزلۂ دل کے ہے جس سے ہر وقت اسے خون پہنچتا رہتا ہے اور جس وقت یہ رسد بند ہو جاتی ہے تو زبان سوکھنی شروع ہو جاتی ہے اور کتابوں کے اوراق میں بند ہو کے رہ جاتی ہے۔ تمام دنیا کی زبانیں جو مردہ کہلاتی ہیں اسی طرح مردہ ہوئیں۔ (ادبی تبصرے ص ۸۱)

معیاری زبان

آج کل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کو جوں کا توں رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ یہ مقدس الفاظ اردو صرف و نحو کے چھو جانے سے نجس ہوجائیں۔ .... بزرگوں نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا احسان کیا مگر آج کل لوگ ان کی تقلید کو ننگ سمجھتے اور ان کی کوششوں کو "غلط العام" سے تعبیر کرتے ہیں حالاں کہ وہ صحیح اصول پر چل رہے تھے اور ہم با وجود ہمہ دانی کے زبان کی اصلی ترقی و نشو و نما کے گر سے ناواقف ہیں۔ ایک دوسرا فریق جو فارسی عربی کے مقبول الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ ٹھونسنا چاہتا ہے اسی نا فہمی میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں زبان کے دشمن ہیں۔ (مقدمات دوم ص ۳۴)

فاتح قوم کی زبان

فاتح قوم کی زبان کے مطالعہ، لکھنے، بولنے اور سننے سے معمولی اور عام ضرورت کے لفظ بھی اس (مفتوح) کی زبان پر اس

طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں انہیں بول جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ بعض حالات میں غیر زبان (یعنی فاتح قوم کی زبان) کے خاص خاص الفاظ اس لیے بھی استعمال کرتا ہے کہ اس کے خیال میں (اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے) ان لفظوں کے استعمال سے وہ اپنا مفہوم زیادہ خو.بی اور قوت کے ساتھ سامعین کے دل نشین کرسکتا ہے، حالانکہ اسے علم ہے کہ ان الفاظ کے مترادف اس کی زبان میں موجود ہیں مگر وہ انہیں استعمال نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ ان سے کلام میں زور پیدا نہیں ہوتا۔ (خطبات ص ۴-۵)

زبان اور شائستگی

زبان کو شایستہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ زبان میں صفائی، شستگی اور پختگی پیدا ہو، وہ نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر ہو اور اس میں مختلف اسالیب بیان کے سانچے موجود ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ زبان میں اعلا درجے کی تصانیف و تالیفات اور غیر زبانوں کی بہترین تصانیف کے ترجموں کا ذخیرہ فراہم ہو جو اہل قلم کی رہ نمائی کرسکے۔ (خطبات ص ۴۵)

زبان اور زمانہ

کوئی زبان ایک ہی حالت میں ایک جگہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اسے زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے ورنہ اس کی قسمت میں فنا ہونا لکھا ہے۔ (خطبات ص ۶۰)

خالص زبان

زبان کے خالص ہونے کا خیال درحقیقت سیاسی ہے لسانی نہیں۔ اس کا باعث قومیت کا بےجا فخر اور سیاسی نفرت ہے - جرمنوں نے فرانسیسی لفظوں کے خلاف جہاد کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مدت تک ان کے ملک میں فرانس کا ادبی اور سیاسی تسلط رہا - یہ خیال ان کے دل میں کھٹکتا تھا اور اس غصے میں انہوں نے فرانسیسی لفظ نکالنے شروع کیے - اسی طرح اور اسی بنیاد پر زکس نے جرمنی لفظوں اور یونانیوں نے ترکی افظوں کا اخراج شروع کیا - سیواجی کے زمانے میں مرہٹی سے فارسی لفظوں کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی - آئرلینڈ میں محض انگریزوں کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جدوجہد جاری ہوئی - ترکوں نے عربی فارسی لفظوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا - ایرانیوں نے بھی ایک زمانے میں عربی لفظوں کے نکال دینے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہے - مگر اب ترکوں کی دیکھا دیکھی عربی لفظوں کے نکال دینے پر آمادہ ہوگئے ہیں - ان سب کی تہ میں سیاسی غم و غصہ ہے - اگر بدگمانی نہ سمجھی جائے تو غالباً یہی خیال بعض جماعتوں میں ہماری زبان سے عربی فارسی الفاظ کے اخراج کا محرک ہے - لفظ جب ایک بار زبان میں آگیا اور رائج ہوگیا تو وہ ہمارا ہوجاتا ہے، غیر نہیں رہتا - اسے غیر سمجھ کر نکال دینا سخت بےدردی ہے - وہ اب جائے تو کہاں جائے، کیوں کہ اب اس کا رنگ روپ بدل گیا ہے -

بعض وقت اس کا تلفظ اور مفہوم بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اصلی وطن میں تو اس کا ٹھکانا نہیں رہا اور یہاں سے دیس نکالا مل گیا۔ اس کی حالت یہودیوں کی سی ہو جاتی ہے یعنی نہ گھرا نہ درا۔ زبان میں یہ ہٹلری جائز نہیں۔ (خطبات ص ۴۷۰-۴۷۱)

زبانوں کا اختلاف

ہر قوم خواہ وہ کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو دنیا میں ایک حیثیت رکھتی ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ زبانیں بھی قوموں کی طرح بڑھتی، گھٹتی اور بدلتی ہیں۔ پھر وہ افراد اور اقوام کی طرح گرد و پیش کے حالات و اثرات اور دوسری زبانوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ جس طرح قومیں مختلف تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اسی طرح زبانوں میں بھی ایک دوسرے سے رشتے ناتے ہیں۔ ایک زمانہ آئے گا جب کہ دنیا کی تمام قوموں کو نوع انسان کے حلقہ میں آکر ایک ہونا پڑے گا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت کب آئے گا! یہ تخیل کی جولانیاں ہیں جو آئندہ کی تاریکی میں پنہاں ہیں اور ان کے ظہور کی پیشین گوئی کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زمانہ ایک روز آئے گا جب بنی نوع انسان ایک قوم اور ایک ذات ہوں گے اور تمام سفیہانہ اور شرمناک اختلافات جو اس وقت ادنا خود غرضیوں کی بدولت بہت اہم نظر آتے ہیں مٹ جائیں گے لیکن زبانوں کا اختلاف پھر بھی باقی رہے گا۔ مگر یہ اختلاف معاندانہ یا منافقانہ نہ ہوگا بلکہ

تمدن اور علم و تہذیب کو فروغ دے گا اور ایک زبان دوسری سے تقویت اور روشنی حاصل کرے گی ۔

(مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر)

بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو صحیح اور فصیح زبان بولیں اور اس بات کی سخت احتیاط کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو یا تحریر میں ہماری زبان کے الفاظ یا طرز ادا کا شائبہ نہ پایا جائے ۔ غیر زبانوں کے بولنے یا لکھنے میں ہم جس بات سے اس قدر پرہیز کرتے ہیں اس کا ہم اپنی زبان میں مطلق خیال نہیں کرتے ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جب کوئی ہندوستانی ، انگریزی بولتا یا لکھتا ہے تو تا امکان اپنی گفتگو یا تحریر میں اپنی زبان کا لفظ یا اسلوب بیان نہیں آنے دیتا اور جہاں تک ہو سکتا ہے اہل زبان کی تقلید کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی لب و لہجے کی نقل اتارنے کی بھی کوشش کرتا ہے شروع شروع میں تو بعض ہندوستانی جنہیں انگریزی بہت چڑ گئی تھی اپنی زبان بھی انگریزی لہجے میں بولنے لگے تھے ۔ برخلاف اس کے اپنی زبان میں بیسیوں انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کر جاتا ہے۔ یا تو اس سے اپنی مشیخت یا علمی فضیلت جتانی مقصود ہوتی ہے یا پھر نا واقفیت اور کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ نا واقفیت اس لیے کہ

اپنی زبان سے پوری طرح واقف نہیں اور کاہلی اس معنے میں کہ آسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی زبان میں ان کے مترادف تلاش کرے۔ اس میں وہ کسی قدر مجبور بھی ہے۔ فاتح قوم کی زبان کے مطالعے، لکھنے، بولنے اور سننے سے معمولی اور عام ضروریات کے لفظ بھی اس کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں بول جاتا ہے۔ (خطبات ص ۳۶۸ - ۳۶۹)

غیر زبان کا تسلط

جب کوئی غیر زبان کسی پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے تو اس میں قومی حمیت اور عصبیت نہیں رہتی اور وہ اپنی قوم سے الگ ایک دوسرا شخص ہوجاتا ہے۔ (خطبات ص ۳۳۱)

تعلیم اور غیر زبان

کسی قوم کو اگر علم سے محروم رکھنا مقصود ہو تو سہل طریقہ یہ ہے کہ آسے غیر زبان کے ذریعے سے تعلیم دی جائے۔ ہمارے ملک میں بھی یہی ہوا۔ غیر زبان میں تعلیم دینے سے یہی نہیں ہوتا کہ ذہنی ترقی رک جاتی، جدت مفقود، قوت مشاہدہ کند ہوجاتی اور ذوق تحقیق پیدا نہیں ہونے پاتا، بلکہ اس کا اخلاق پر بھی بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اس تعلیم کا بڑا وصف نقالی ہے جو بد ترین بد اخلاقی ہے۔ آدمی انسان سے کھلونا بن جاتا ہے۔ زبان کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات، تہذیب و تمدن، ذہنی اور روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں، قوم کی ذہنیت

اور اس کی زبان میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ (خطبات ص ۳۰۶)

غیر زبانوں کو سیکھنے کا روشن پہلو

دوسرے کی زبان سیکھنے سے خود ہماری زبان پر نیز ہمارے دلوں پر اثر پڑتا ہے اور زبان کے ساتھ زبان والوں کی طرف سے دلوں میں اُنس اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ (خطبات ص ۱۳)

مخلوط زبان

یوں تو دنیا میں کوئی زبان خالص نہیں۔ ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لیے ہیں، یہاں تک کہ جو زبانیں مقدس کہلاتی ہیں وہ بھی اچھوتی نہیں۔ لیکن جسے ہم مخلوط زبان کہتے ہیں اس کی خاص حیثیت ہوتی ہے۔ مخلوط زبان سے مراد وہ زبان ہے جو دو زبانوں کے آپس میں گھل مل جانے سے ایک نئی صورت اختیار کرلے اور اس کا اطلاق ان دو زبانوں میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے جن سے مل کر وہ بنی ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے دو اجزا کیمیائی طور سے اس طرح ترکیب دیے جائیں کہ وہ اپنی ہیئت، تاثیر اور خاصیت میں ایک نئی چیز بن جائیں۔ اب اس کا اطلاق اُن دو اجزا میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے گا۔ (خطبات ص ۳۶۵-۳۶۶)

مخلوط یعنی کھچڑی زبانوں کے وجود میں آنے کے کئی سبب بیان کیے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک

ملک گیری ہے۔ ایک ملک گیری تو یہ ہوئی کہ حملہ آور آیا اور لوٹ کھسوٹ کے چل دیا۔ دوسری قسم ملک گیری کی یہ ہے کہ فاتح نے کسی ملک کو فتح کر کے اس کا الحاق اپنے ملک سے کرلیا یعنی اُسے اپنی سلطنت کا صوبہ بنا لیا۔ پہلی صورت میں ظاہر ہے کہ فاتح قوم کا کوئی اثر مفتوح قوم پر نہیں ہوتا، اگر ہوتا بھی ہے تو نہایت خفیف اور عارضی جو قابل اعتبار نہیں۔ دوسری صورت میں یا تو یہ ہوتا ہے کہ فاتح جبراً اپنی زبان اس دیس میں جاری کر دیتا ہے یا اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں زبان کے مخلوط ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

لیکن ملک گیری کی ایک تیسری قسم بھی ہے، وہ یہ کہ فاتح مفتوح ملک میں آ کر بس جاتا اور اس ملک کی قوم سے مل جل کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کا اثر دیر پا اور مستقل ہوتا ہے اور اس صورت میں دو قوموں کے ملنے سے اُن دونوں کی زبان میں بھی ٹکر ہوتی ہے۔ اگر فاتح میں روا داری ہے اور مفتوح سے برابر کا برتاؤ کرتا ہے تو دونوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان پیدا ہوجاتی ہے۔ اسے ہم نہ فاتح کی تہذیب اور زبان کہ سکتے ہیں اور نہ مفتوح کی، بلکہ ان میں دونوں کی تہذیبیں اور زبانیں برابر کی شریک ہوتی ہیں اور دونوں قومیں اس کی بانی اور اس کی وارث ہوتی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر کسی مخلوط زبان یا تہذیب کے پیدا ہونے کی گنجائش

نہیں ہوتی۔ (خطبات ص ۳۶۶-۳۶۷)

مخلوط زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں طرفین کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ جب دو مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں تو ہرایک کو اپنی زبان کی بعض ایسی خصوصیتیں ترک کرنی پڑتی ہیں جو اس زبان سے مخصوص ہیں اور جس کے سمجھنے یا قدر کرنے سے غیر زبان والا قاصر رہتا ہے۔ اس لیے دونوں زبان والے ایک دوسرے کی خاطر اپنی بعض خصوصیتوں اور لفظی نزاکتوں کو قربان کردیتے ہیں۔ (خطبات ص ۳۴۷)

مخلوط زبان میں ہوتا یہ ہے کہ وہ غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے مخلوط نہیں ہوتی. بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے میل سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ (خطبات ص ۳٦۸)

مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک اور بات بھی عمل میں آتی ہے جو قابل غور ہے۔ یعنی اُن میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو یک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آجائے اپنی بعض خصوصیات ترک کرنی پڑتی ہیں اور صرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہے اور اس طرح دونوں میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہے جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہے۔ (خطبات ص ۳۷۰)

عورتوں کی زبان

اگرچہ مرد عورت ایک ہی نوع ہیں مگر غور سے دیکھو تو وہ باوا آدم کی نسل ہیں اور یہ اماں حوا کی اولاد ہیں۔ اماں حوا نے کچھ ایسی گھڑی جنم لیا تھا کہ ہزاروں لاکھوں برس ہو گئے یہ تفریق مٹائے نہیں مٹتی۔ جہاں پردہ نہیں وہاں بھی کاموں کی تقسیم اور اشغال کے اختلاف نے کچھ نہ کچھ تفریق قائم کر رکھی ہے۔ اگرچہ معاشرت کے یکساں اور تعلیم کے ہونے سے یورپ اور امریکہ نیز دوسرے ممالک میں امتیاز کم ہوتا جاتا ہے، اور خصوصاً مرد اور عورت کی زبان میں تقریباً کوئی فرق نہیں رہا، مگر عورت کی اصل زبان یعنی للو ہر ملک میں اسی طرح بے تحاشا اور بے تکلف چلتی ہے۔ زبان کیا ہے قینچی ہے جو کترتی چلی جاتی ہے۔

لسانی اعتبار سے عورتیں مردوں سے زیادہ تیز ہیں۔ وہ جلد سیکھتی، ہیں جلد سنتی ہیں اور جلد جواب دیتی ہیں۔ مرد ان کے مقابلہ میں دھیما ہے، وہ جواب دینے سے پہلے سوچتا ہے، تامل کرتا ہے، اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے لفظ ڈھونڈتا ہے، اور کبھی کبھی انہیں چبا چبا کر نکالتا ہے، مگر عورت پھٹ سے جواب دیتی ہے جیسے پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ ایک مشہور انگریزی انشاپرداز سوئفٹ نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "بہت

سے مردوں اور اکثر عورتوں میں زبان کی طراری مضمون اور الفاظ کی کمی کی وجہ سے ہے کیوں کہ جو شخص زبان پر پورا قادر ہے اور خیالات سے اس کا دل معمور ہے، وہ خیال اور الفاظ کے انتخاب میں کسی قدر تامل کرے گا۔ لیکن معمولی لوگوں کے پاس محدود اور خاص قسم کے خیالات ہوتے ہیں اور الفاظ کا ذخیرہ بھی محدود اور خاص ہی ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے وہ اپنے خیالات ادا کرتے ہیں، اور وہ ان کی زبان پر تیار رکھے رہتے ہیں۔ اس کی یہی صورت ہے کہ مثلاً جب گرجا خالی ہوتا ہے تو لوگ بہت جلد باہر نکل آتے ہیں لیکن بھرا ہوا ہو تو دروازے تک پہنچنے میں دیر لگتی ہے۔ عورتوں کی زبان درازی اور طراری دنیا میں ہر جگہ مشہور ہے اور لوگوں نے اس پر خوب خوب فقرے کسے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہزارہا سال سے مردوں اور عورتوں کے کاموں کی تقسیم یکساں چلی آتی ہے۔ اگرچہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ امتیاز کسی قدر کم ہوتا چلا جاتا ہے تاہم دنیا کے بہت بڑے حصے میں ابتدائی حالت اب تک قائم ہے۔ مرد اکثر ایسے کام کرتا رہا اور اب بھی کرتا ہے جن میں زیادہ قوت و توانائی اور توجہ صرف کرنی پڑتی ہے۔ جنگ و جدل اور شکار اس کا دائمی پیشہ ہو گیا ہے۔ یہ ایسے کام ہیں جن میں بات چیت کرنے کا کم موقع ملتا ہے بلکہ خاموش رہنا زیادہ مفید ہے۔ کیوں کہ ایسے موقعوں پر بولنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا اور جب کام ختم ہو گیا تو وہ سو گیا یا

خاموش پڑا رہا - بر خلاف اس کے عورتوں کے کام کی نوعیت بالکل جدگانہ تھی - اس کے کام زیادہ گھر سے یا زراعت سے متعلق تھے اور اب بھی ہیں - مثلاً پکانا، ریندھنا، کاتنا، سینا، پرونا ، دھونا ، لیسنا ، بچوں کی دیکھ بھال ، یہ ایسے کام ہیں جن میں بہت زیادہ توجہ اور طاقت و توانائی کی ضرورت نہیں ہوتی - وہ کام بھی کرتی رہتی ہیں اور باتیں بھی کرتی رہتی ہیں - ادھر چرخا چل رہا ہے آدھر زبان چل رہی ہے ، یہ حالت اب تک باقی ہے - ممکن ہے کہ جب ہماری معاشرت میں انقلاب پیدا ہو تو یہ فرق بھی اٹھ جائے -

(مضمون ''دیوان رنگین ،، رسالہ اردو ، اکتوبر ۱۹۲۲ع)

عورتوں اور مردوں کے لب و لہجہ اور زبان میں کچھ نہ کچھ ہر جگہ فرق پایا جاتا ہے لیکن ہندوستان میں اور خاص کر اردو زبان میں اس فرق نے ایک نئی بول چال پیدا کردی ہے - بعض قدیم مصنفوں نے ایسے قبیلوں اور قوموں کا ذکر کیا ہے جن میں عورتوں کی زبان بالکل جدا ہے یا ان کی اور مردوں کی زبان میں کچھ کچھ فرق ہے - چنانچہ سترھویں صدی میں ایک فرانسیسی مصنف راچفرٹ نے ایک قبیلے کارب نامی کے حالات اور زبان کی تحقیق کی - وہ لکھتا ہے کہ ''بہت سے جملے اور الفاظ ایسے ہیں جو صرف مرد ہی استعمال کرتے ہیں اور اگرچہ عورتیں انہیں سمجھتی ہیں مگر کبھی زبان سے نہیں نکالتیں - اسی طرح بہت سے الفاظ اور جملے عورتوں سے مخصوص ہیں - اگر مرد انہیں بولیں تو ان کی ہنسی ہو - ان کی گفتگو

سے یہ معلوم ہوتا ہے گویا عورتیں ایسی زبان بولتی ہیں جو مردوں کی زبان سے جدا ہے۔،، (رسالہ اردو اکتوبر ۲۲ء)

عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے، وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی خوبیاں یا کمزوریاں دیکھ لیتی ہیں جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امور خانہ داری، بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات ہیں اس میں صرف ہوتا ہے اور اس اقلیم میں ان کی عمل داری کامل ہوتی ہے۔ پھر ان کی زبان اور لہجے میں قدرتی لطافت، نزاکت اور لوچ ہوتا ہے اس لیے انھوں نے اپنے تعلقات کے لحاظ سے جو طرح طرح کے لفظ، محاورے اور مثلیں بنائی ہیں وہ بڑی لطیف، نازک، خوبصورت اور سبک ہیں۔ (خطبات ص ۱۲۱)

الفاظ

الفاظ کی سیرت

الفاظ بھی ایک طرح انسان کی طرح جاندار ہیں وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے، مرتے، بڑھتے اور گھٹتے ہیں - ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ وہ گزشتہ زمانہ کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے، وہ قومی ترقی کے ساتھ ترقی کرتا اور قومی تنزل کے ساتھ تنزل کرتا ہے۔ یہ بھی انقلاب زمانہ سے انسان کی طرح کبھی ادنا سے اعلا اور اعلا سے ادنا شریف سے رذیل اور رذیل سے شریف ہو جاتا ہے - لیکن ہر لفظ زبان میں ایک منصب رکھتا ہے اور اس کے صحیح استعمال پر وہی قادر ہو سکتا ہے جو اس کی سیرت سے آگاہ ہے، یہ انشاپردازی کا بڑا گر ہے - (تنقیدات عبدالحق ص ۱۱)

الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ وہ ان سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی تراکیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں - (مقدمات دوم، ص ۱۸)

لفظ کا صحیح استعمال

لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ (چند ہم عصر ص ۱۹۸)

الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہوجاتے ہیں۔ اول اول الفاظ کا یہی حال ہوتا ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کردیتا ہے اور صحت و غیر صحت کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کرلیں، آئندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانے کی کسوٹی پر پورا اترا تو خود ٹکسالی ہوجائے گا اور اپنی جگہ آپ پیدا کرلے گا۔ (مقدمات دوم ص ۲۰۸)

غیر زبانوں سے بعض الفاظ کا مستعار لینا ناگزیر ہے لیکن بلا وجہ اور خواہ مخواہ الفاظ مستعار لیتے چلے جانا تخیل کی کمی اور قوت نطق کا ضعف ہے۔ بعض لوگ محض فیشن کے خیال سے اور بعض سستی کی وجہ سے اور بعض علمی شان دکھانے کو غیر زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور یہ سب اخلاقی اور دماغی ضعف کی دلیلیں ہیں۔ اپنے الفاظ استعمال کرنے میں (خواہ مرکب ہوں یا مفرد) ایک

بڑا فائدہ یہ ہے کہ غیر تعلیم یافتہ بھی آسانی سے انہیں سمجھ سکتا ہے۔ جن ممالک میں لوگ بیدار ہوتے جاتے ہیں (مذکورہ) خیال عام ہوتا جارہا ہے۔ (مقدمات، دوم ص ۱۸۸)

ہر لفظ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے اور اس کی خوبی اور برائی کا انحصار استعمال کرنے والے کے ذوق پر ہے۔ لفظ بذاتہ نہ بھلا ہے نہ برا۔ ایک اچھے سے اچھے لفظ کا بے موقع استعمال آسے نا گوار اور برا بنا دیتا ہے اور ایک معمولی اور عامیانہ لفظ کا صحیح اور بر محل استعمال عبارت میں خاص شان پیدا کریتا ہے۔ (ادبی تبصرے ص ۸۰)

انشا پرداز یا ادیب کے پیش نظر یہ اصول ہونا چاہئے کہ عام استعمال میں سب سے بہتر لفظ کون سا ہے خواہ کسی زبان کا ہو۔ الفاظ کے انتخاب میں لفظ کی نسل و اصل کو نہیں دیکھنا چاہئیے بلکہ یہ دیکھنا چاہئیے کہ کونسا لفظ خیال کو صحت اور خوبی کے ساتھ ادا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب کی بنیاد اس اصول پر رکھنا کہ کوئی لفظ غیر زبان کا نہ آنے پائے خواہ کیسا ہی موزوں، صحیح اور عام فہم کیوں نہ ہو نہایت گمراہ کن اصول ہے اور زبان کے حق میں سخت مضر ہے۔ (خطبات ص ۱۳۴)

بدیسی الفاظ

بدیسی لفظوں سے زبان خراب نہیں ہوتی بلکہ بر خلاف اس کے اس میں وسعت اور قوت اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ بہت سے غیر ضروری الفاظ بھی باہر سے آ کر داخل ہو جاتے ہیں۔ غیر ضروری سے میری مراد ان لفظوں سے ہے کہ جن کے ہم معنی لفظ پہلے سے زبان میں موجود ہیں، لیکن مترادف الفاظ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ زبان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور زبان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک مدت کے استعمال کے بعد مترادف الفاظ کے مفہوم میں خود بہ خود ایسے نازک فرق پیدا ہو جاتے ہیں جس سے زبان کی لطافت بڑھ جاتی ہے اور وہ لفظ جو پہلے غیر ضروری سمجھے جاتے تھے ضروری ہوجاتے ہیں۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ بدیسی الفاظ سے زبان بوجھل اور بھدی ہو جاتی ہے۔ وہ لفظ جو غیر زبان سے آ کر داخل ہو جاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ زبان میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں اور ان کی اجنبیت بالکل جاتی رہتی ہے اور ان میں اور دیسی لفظوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس لیے وہ زبان پر بار نہیں ہوتے، بلکہ اس میں آسانی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔

انسانی خیال کی کوئی تھاہ نہیں اور نہ اس کے تنوع اور وسعت کی کوئی حد ہے۔ زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپور ہو، خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک فرقوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جاتے ہیں۔ مترادف الفاظ ایسے موقعوں پر بہت کام آتے ہیں۔ مترادف الفاظ سب ہم معنی نہیں ہوتے، ان کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور فرق ہوتا ہے۔ اس لیے

ادائے مطالب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

خاص کر شاعری کے اغراض کے لیے مترادف الفاظ کا کثرت سے ہونا بہت کام آتا ہے۔ شاعر اُن کے ذریعے سے لطیف سے لطیف خیال اور نازک سے نازک جذبات کو ادا کر سکتا ہے۔ پھر اُسے ردیف و قافیے کے لیے بہت سہولت ہوجاتی ہے۔

ادیب اور شاعر کے لیے لفظ کا انتخاب کلام میں جان ڈال دیتا ہے۔ مخلوط زبان میں انتخاب کی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ (خطبات ص ۴۷۲-۴۷۳)

جس طرح دنیا میں کوئی قوم بغیر خارجی اثرات اور غیر اقوام کے میل جول کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اسی طرح دنیا میں شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو کہ اس میں غیر زبانوں کے الفاظ آ کر نہ مل گئے ہوں اور جو مخلوط نہو۔ ورنہ کسی زبان کا علمی میدان میں آنا یا آگے بڑھنا دشوار ہو جائے۔ بعض صورتوں میں ان بیرونی الفاظ نے ایسے قدم جمائے کہ زبان کی اصل ہیئت کو بدل دیا اور اصل ملکی زبان کے الفاظ سے ان کی تعداد بڑھ گئی۔ (مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر)

غیر زبان کے الفاظ کا استعمال

جب غیر زبان کے الفاظ کا استعمال عادت اور فیشن میں داخل ہوجاتا ہے تو پھر اس کی روک تھام مشکل ہوجاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روز مرہ کی ضروریات کے ایسے لفظ بھی جن کے ہم معنی اپنی زبان میں پہلے سے موجود

ہوتے ہیں یا ان کے مفہوم اپنی زبان کے ذریعے ذرا سے رد و بدل یا کسی اور طریقے سے بآسانی ادا ہوسکتے ہیں، زبان میں داخل ہوجاتے ہیں۔ گو یہ سلسلہ ایک لحاظ سے نا مناسب ہو، مگر اس سے زبان میں وسعت اور شوکت پیدا ہوجاتی ہے اور ادیب کے لئے ایک وسیع اور زرخیز میدان نکل آتا ہے جس میں اسے گونا گوں خیالات کے اظہار اور تخیل کی جولانی کا موقع ملتا ہے۔ مترادفات میں سے موقع و محل کے لحاظ سے ٹھیک لفظ کا انتخاب ادیب کا معمولی کام نہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ خیالات کی مختلف باریکیوں اور معانی کی نزاکتوں کے لیے ایک ہی مفہوم کے مختلف پہلوؤں کے واسطے متعدد الفاظ موجود ہوں۔ (خطبات ص ٦)

نئے الفاظ اور خیالات

الفاظ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی آجاتے ہیں، صرف لفظوں کا ذخیرہ کوئی چیز نہیں۔ بڑی چیز ان کا استعمال ہے جو خیال کے صحیح طور پر ادا کرنے میں ہے۔ مترادفات کے نازک فرق، خیالات میں صفائی اور صحت بیان کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اور یہ نہ بھی ہو تو ایک فائدہ یہ ہے کہ بار بار ایک لفظ کے اعادے سے جو بیان میں بھدا پن آجاتا ہے وہ رفع ہوجاتا اور کلام میں حسن پیدا ہوجاتا ہے۔

اگر زبان کی قدر و منزلت ان مقاصد کے پورا کرنے میں ہے جن کے لیے زبان بنی ہے تو ہمیں اس امر کو ماننا

پڑیگا کہ غیر زبان کے الفاظ داخل ہونے سے ہماری زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے۔ (خطبات ص ۴۷۴)

لفظ کا معیار

لفظ کا معیار رواج ہے اور یہی اس کے مستند ہونے کی سند ہے۔ (خطبات ص ۴۵۲)

نئے الفاظ اور اصطلات علمیہ

جو ملک ترقی یافتہ ہیں یا جہاں علم کا شوق ہے، لوگ اپنے اپنے پیشوں اور فنون میں نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں، علمی تحقیقات کرتے ہیں، اپنے شوق اور محنت سے یا ضرورت سے ایسی ایسی جدتیں کرتے ہیں جن سے ایک دنیا میں انقلاب پیدا ہوجاتا ہے۔ انہیں علمی تحقیقات کے ضمن میں خود بخود نئے نئے لفظ اور اصطلاحیں بنتی اور رواج پاتی ہیں اور کتابوں سے زبانوں پر جاری ہوجاتی ہیں۔ (مقدمات، دوم ص ۱۸۰)

وضع اصطلاحات

سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجائش ہے۔ اس بارہ میں ایک مدت کے تجربے اور کامل غور و فکر اور مشورہ کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ تنہا نہ تو ماہر علم صحیح طور سے اصطلاحات وضع کر سکتا ہے اور نہ ماہر لسان۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ اور ایک کی کمی دوسرا پورا کرتا ہے۔ اس لئے اس اہم کام کو

صحیح طور سے انجام دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں ایک جا جمع کئے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے مشورے اور مدد سے ایسی اصطلاحات بنائیں جو نہ اہل علم کو ناگوار ہوں نہ اہل زبان کو۔ (مقدمات دوم ص ۲۰۶)

دخیل الفاظ

دخیل الفاظ کو مستعار الفاظ بھی کہتے ہیں۔ جو انگریزی لفظ (Loan Words) کا ترجمہ ہے۔ لیکن مستعار کا لفظ زیادہ موزوں نہیں کیوں کہ مستعار اس شے کو کہتے ہیں جو مانگ کر لی جائے۔ جو چیز کسی سے مانگ کر لی جاتی ہے اس میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ پھر واپس کردی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ جب تک وہ ہمارے قبضے میں ہے تو وہ شخص جس سے مانگے لی گئی ہے اس کے استعمال سے محروم رہے گا۔ جن لفظوں کو ہم مستعار کہتے ہیں ان میں دونوں شرطیں نہیں پائی جاتیں۔ جو لفظ کسی غیر زبان سے ہماری زبان مین آگیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنی اصلی زبان میں استعمال سے خارج ہوگیا اور نہ اس کی واپسی کا کوئی محل ہے۔ اس لیے ایسے لفظوں کے لئے دخیل کا لفظ زیادہ موزوں ہے اور قدیم سے اسی مفہوم میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔

دنیا کی کوئی زبان اچھوتی نہیں۔ ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لئے ہیں کیوں کہ کوئی قوم ایسی نہیں جو الگ تھلگ

رہی ہو۔ جب ایک قوم کا کسی دوسری قوم سے سابقہ پڑتا ہے یا آپس میں ربط ضبط پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کسی وجہ سے ہو ایک کے لفظوں کا دوسرے کی زبان میں داخل ہونا لازم ہے۔ مثلاً اردو یا انگریزی جیسی مخلوط زبانوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا آنا ناگزیر تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک زبان کے لفظ کن اسباب سے دوسری زبان میں داخل ہوتے ہیں:

جب ایک شخص کسی دوسرے سے ملتا ہے تو اگرچہ وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں تاہم ایک کی زبان کا اثر دوسرے پر ضرور پڑتا ہے، یا ایک دوسرے کا اثر قبول کرتا ہے۔ یہی حال زبان کی مختلف شاخوں کا ہے کہ وہ ایک دوسری کو یا اصل زبان کو متاثر کرتی ہیں یا ان کا اثر قبول کرتی ہیں۔ جب ایک زبان کے بولنے والوں یا ایک زبان یا ایک جیسی زبانوں کا یہ حال ہے تو غیر زبانوں کا اثر ایک دوسری پر کہیں زیادہ ہوگا۔

دو زبانوں کا میل یا تو بالواسطہ ہوتا ہے یا بلا واسطہ۔ بالواسطہ تو دو زبانوں کے بولنے والوں کے میل جول سے ہوتا ہے اور بلا واسطہ ادب کے ذریعہ سے۔ بالواسطہ اثر کی مندرجۂ ذیل چند صورتیں ہیں:-

۱ — جب کہ دو زبانوں کے حدود ارضی قریب ہوں تو سرحد کے اضلاع پر یہ اثر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

۲ — جب ایک بڑی تعداد کسی قبیلے یا قوم کی دوسرے ملک میں آباد ہو جائے یا ترک وطن کر کے یا دوسری قوم کو یا ملک کو فتح کر کے یا سیر و سیاحت یا تجارت کی غرض سے ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک میں ایک مدت تک قیام کریں۔

جب ان ذرائع سے دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں باہمی تعلقات پیدا ہوں گے تو جس قدر ان کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر دونوں زبانوں پر ایک دوسرے کا زیادہ اثر ہوگا۔ لیکن گہرا تعلق یا تو اس حالت میں ہوتا ہے جب کہ ایک قوم ترک وطن کر کے دوسرے ملک میں آباد ہو جاتی ہے یا جب ایک قوم کسی دوسرے ملک کو فتح کر کے اس پر قابض ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں ایک مدت بعد دونوں قوموں میں ایک بڑی جماعت ایسی پیدا ہوجاتی ہے۔ جسے ہم دو زبان کہیں گے، یعنی وہ اپنی زبان کے علاوہ دوسرے کی زبان بھی سیکھ لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دونوں قوموں کے تقریباً سب لوگ دو زبان ہوجاتے ہیں۔ جب یہ صورت واقع ہوگی تو ان دونوں زبانوں میں سے یا تو کوئی ایک فنا ہو جائے گی یا دونوں کے میل سے کوئی ایک نئی مخلوط زبان پیدا ہوجائے گی۔ جب ان حالات میں دو ایسی قومیں ملتی ہیں تو مشاہدے نیز تاریخ کے مطالعہ اور مختلف زبانوں کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے اور ماہرین لسانیات نے اس کی تصدیق کی ہے کہ باہر سے آنے والوں یا فاتح

کی زبان مخلوط نہیں ہوتی بلکہ ملک کے اصلی باشندوں کی زبان غیر زبان کے اثر سے مخلوط ہوجاتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیوں کہ جب ہم کسی غیر زبان کے بولنے یا سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں ہماری اپنی زبان کا لفظ نہ آئے اور کسی حال میں اپنی زبان کے اسلوب یا طرز بیان کی چھینٹ تک نہ پڑنے پائے - بر خلاف اس کے ہم اپنی زبان میں اس غیر زبان کے الفاظ بلا تکلف بول جاتے ہیں جیسا کہ ہم انگریزی تعلیم یافتہ گروہ میں دیکھتے ہیں کہ وہ بات چیت میں بغیر خیال و ارادہ کے بھی انگریزی لفظ بولتے چلے جاتے ہیں - پہلے اس کی نوبت خبط تک پہنچ گئی تھی، اب اس میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں - بعض اوقات یہ بات فیشن میں داخل ہو جاتی ہے اور لوگ ” فیشن ایبل ،، بننے کے خیال سے ایسا کرتے ہیں - کبھی علمی مشیخت جتانے کو بھی ایسا کیا جاتا ہے۔ ایک وجہ کاہلی بھی ہے کہ ہم خیال ظاہر کرتے وقت اپنی زبان کا لفظ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور غیر زبان کا لفظ استعمال کر جاتے ہیں - مترجمین کی بدولت بھی بہت سے غیر زبان کے لفظ اپنی زبان اور ادب میں داخل ہو جاتے ہیں- .... یہ بھی مسلم قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے لفظ جو کسی زبان میں داخل ہوتے ہیں یا کسی زبان کو مخلوط کرتے ہیں تو وہ اصل زبان کی صرف و نحو کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

دخیل الفاظ تاریخی حیثیت بھی رکھتے ہیں، اور بعض حالتوں میں نہ صرف تہذیبی حالت کو بلکہ قوموں کی اندرونی کیفیت کو بھی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قومیں ایسی ہیں کہ جن میں الفاظ ایک دوسرے سے نہیں لئے گئے تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان دونوں میں کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک زبان کے لفظ دوسری زبان میں پائے جاتے ہیں تو اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوگا کہ ایک قوم کو دوسری قوم سے سابقہ رہا ہے بلکہ اگر صحیح طور پر ان الفاظ کا کھوج لگایا جائے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے باہمی تعلقات کس قسم کے تھے اور زندگی کے کن شعبوں میں ایک کو دوسرے پر فوقیت تھی۔ اگر ہماری معلومات کے دوسرے ذرائع مفقود بھی ہو جائیں تو یہ دخیل الفاظ ہمیں بہت سی ایسی پتے کی باتیں بتا سکتے ہیں جن کے بتانے سے تاریخ بھی قاصر رہتی ہے۔

الفاظ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی اور قوم کوئی ایسی نئی چیز بناتی یا پیدا کرتی ہے جسے پڑوسی قومیں بھی پسند کرتی ہیں تو وہ اس شے کے ساتھ اس کے نام کو بھی لے لیتی ہیں۔ یہ عام قاعدہ ہے لیکن مستثنیٰ صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر اپنی زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود ہے جو بغیر کسی خاص زحمت کے باہر کی آئی ہوئی نئی چیز پر ٹھیک بیٹھتا ہے تو اپنی ہی زبان کا لفظ استعمال کرلیا جاتا ہے۔۔۔۔

لیکن جب اپنی زبان کا لفظ آسانی سے نہیں ملتا تو غیر زبان کا بنا بنایا لفظ لے لیا جاتا ہے۔ مگر عموماً اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایسی صورتوں میں بھی جب کہ ہم بغیر زیادہ زحمت کے اپنی زبان کے ذخیرے سے مناسب لفظ گھڑ سکتے ہیں غیر زبان کا لفظ اختیار کرلیا جاتا ہے۔ انسان بالطبع کاہل واقع ہوا ہے۔ جب بنی بنائی چیز ملتی ہے تو زحمت گوارا نہیں کرتا۔ لیکن جب کوئی شے ایسی ہے جو ہمارے ملک میں بھی پائی جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کے لئے خواہ مخواہ غیر زبان کا لفظ استعمال کریں۔ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دخیل الفاظ زیادہ تر یا تو اصطلاحی ہوتے ہیں یعنی ان کا تعلق کسی سائنس یا علم یا اس کی کسی شاخ سے ہوتا ہے یا ایسی قدرتی اشیا یا حرفوں یا صنعتوں سے متعلق ہوتے ہیں جو دوسرے ملک میں نہیں ہوتیں۔ ان الفاظ سے بغیر دقت کے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کس وقت کیا لیا گیا۔

ایک گروہ کا یہ خیال ہے (اور ایسا گروہ تقریباً ہر زبان میں ہوتا ہے) کہ اپنی زبان کو غیر زبانوں کے الفاظ سے پاک صاف رکھنا چاہئیے۔ اپنی رائے کی تائید میں وہ یہ دلائل پیش کرتے ہیں :-

(الف) کثرت سے غیر زبانوں کے لفظ لینا اس امر کا ثبوت ہے کہ اہل ملک میں تخیل کی کمی اور ذہنی قوت کا ضعف ہے۔ جو

لوگ نئے خیال کے لئے اپنی زبان کے لفظ تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرسکتے تو اس سے پایا جاتا ہے کہ ان میں قوت ایجاد کی کمی ہے اور وہ زبان کی مزاج شناسی کا کافی ملکہ نہیں رکھتے۔

(ب) غیر زبانوں کے الفاظ کے استعمال کا شوق کچھ تو خود پسندی کی وجہ سے اور کچھ اظہار علمیت کے خیال سے ہے، اور یہ کچھ اچھی بات نہیں۔

(ج) غیر زبان کے مفرد لفظ کے مقابلے میں اپنی زبان کا مرکب لفظ زیادہ قابل ترجیح ہے، اس لئے کہ کم علم اشخاص بھی مرکب لفظ سے کچھ نہ کچھ مفہوم ضرور پالیتے ہیں۔

(د) اپنی زبان کے لفظوں کا استعمال ہم میں بجا طور پر یہ فخر پیدا کرتا ہے کہ ہم ایسی زبان اور تہذیب کے وارث ہیں جو ہم تک اپنے بزرگوں سے پہنچی ہے۔ اس سے ہماری قدیم روایات قائم رہتی ہیں اور گزشتہ کا حال سے ربط باقی رہتا ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے لئے قابل فخر ہیں۔

ان دلائل میں جذبات کی جھلک زیادہ ہے۔ خیال میں اور عمل مین بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہت سی باتیں منطقی جانچ سے بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن عمل کے دائرے میں آ کر منطق کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ عملی دنیا میں دو اور دو ہمیشہ چار نہیں ہوتے۔ اب ہم دلائل پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔

۱- زبان کے خالص ہونے کا خیال درحقیقت سیاسی ہے نہ کہ لسانی۔ اس کا باعث قومیت کا بیجا فخر یا سیاسی نفرت ہے۔ جرمنوں نے فرانسیسی لفظوں کے خلاف جو جہاد کیا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مدت تک ان کے ملک پر فرانس کا ادبی، تہذیبی اور سیاسی تسلط رہا۔ یہ بات ان کے دل میں کھٹکتی تھی۔ اس غم و غصہ میں انہوں نے فرانسیسی لفظ نکالنے شروع کیے۔ اسی طرح اور اسی بنیاد پر زکس نے جرمنی لفظوں اور یونانیوں نے ترکی لفظوں کا اخراج شروع کیا۔ سیواجی کے زمانے مین مرہٹی سے فارسی لفظوں کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزوں کی مخالفت مین انگریزی زبان کے خارج کرنے اور آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جد و جہد جاری ہوئی۔ ترکوں نے عربی فارسی لفظوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ مفتوح فاتح کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ عربوں نے ایران فتح کیا تو ان کی تہذیب اور زبان نے ایرانی تہذیب اور

خصوصاً زبان کا رنگ بالکل بدل دیا - گزشتہ صدی میں جب قومیت کا جنون دنیا بھر میں چھایا ہوا تھا تو ایرانیوں کا قومی جذبہ بھی جوش میں آیا اور انہوں نے عربی الفاظ کے نکالنے اور ان کی جگہ اپنے پرانے لفظ رکھنا شروع کئے اور پرانے نہ ملے تو نئے تراشے - مگر یہ تحریک کچھ کام یاب نہ ہوئی، پچھلے دنوں پھر اس قسم کی کوشش کی گئی لیکن اب وہ دھیمی پڑ گئی - ہندوستان میں اردو کے ساتھ محض اس وجہ سے بے دردانہ سلوک کیا جارہا ہے کہ یہ اسلامی عہد کی یادگار ہے، اور اس میں اسلامی تہذیب کے بھی کچھ نشان پائے جاتے ہیں - یہی نہیں بلکہ ہندی میں جو عربی فارسی لفظ داخل ہوگئے ہیں اور صدہا سال سے رائج ہیں اور جنہیں عامی و عالم، شہری اور دیہاتی بے تکلف بولتے چلے آئے ہیں وہ بھی چن چن کے خارج کیے جارہے ہیں اور ان کی جگہ سنسکرت کے ثقیل، نامانوس لفظ داخل کرکے ایک عجیب و غریب زبان بنائی جارہی ہے، جس کے سمجھنے اور بولنے والے کہیں نہیں پائے جاتے - ان سب کی تہ میں سیاسی غم و غصہ اور نفرت ہے - وہ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ لفظ جب ایک بار اپنی زبان میں آگیا اور کھپ گیا تو وہ غیر نہیں رہتا، اپنا ہوجاتا ہے - اکثر اوقات ان لفظوں کا رنگ و روپ ایسا بدل جاتا ہے اور بعض لفظوں کے تلفظ اور مفہوم میں اس

قدر تغیر ہوجاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے دیس یا کسی دوسری زبان میں بار پانے کے قابل نہیں رہتے۔ ایسے لفظوں کو خارج کرنا بڑی بے دردی ہے۔ علاوہ اس کے جو مقام اس نے زبان میں پیدا کرلیا ہے اور جو خاص حیثیت اس نے حاصل کی ہے وہ نئے لفظ کو میسر نہیں ہوسکتی۔

۲۔ خیالات، حرفت و صنعت اور ایجادیں ایک قوم سے دوسری قوم کو پہنچتی ہیں اور بنی نوع انسان کا مشترک ورثہ ہوجاتی ہیں۔ جو چیزیں کسی ملک میں پیدا ہوتی ہیں یا کوئی نیا خیال یا ایجاد کہیں رونما ہوتا ہے تو اس غیر ملکی شے، ایجاد یا خیال کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی دوسرے ملکوں میں پہنچ جاتا ہے۔ سویابین، الپکا، بایسکل، موٹر (کار) بالشوک، کومیونسٹ جیسے الفاظ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچے اور ہر ملک میں رائج ہو گئے۔ ایک آزاد قوم کو جسے اپنی قوت کا احساس ہے اور بیرونی یا پردیسی اثرات سے مرعوب ہونے کا خوف نہیں، ایسے پردیسی پیداوار کے بدیسی ناموں کو خوشی خوشی قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ البتہ اپنی کمزوری یا اپنی پستی کا احساس ہمیں بعض اوقات ان باتوں کی مخالفت پر آمادہ کردیتا ہے۔

۳۔ وطن پرستوں کا خیال ہے کہ بدیسی لفظوں کے آنے سے زبان خراب ہو جاتی ہے۔ ہمارے قومی احساس

کو ٹھیس لگتی ہے - اس سے ہماری زبان کی بے مائیگی ظاہر ہوتی ہے اور زبان بوجھل اور بھدی ہوجاتی ہے - یہ خیال صحیح نہیں - بدیسی لفظوں سے زبان خراب نہیں ہوتی بلکہ بر خلاف اس کے اس میں وسعت اور قوت اور شان پیدا ہوجاتی ہے - یہ سچ ہے کہ بعض اوقات بہت سے غیر ضروری الفاظ بھی باہر سے آکر داخل ہو جاتے ہیں - غیر ضروری سے میری مراد ان لفظوں سے ہے جن کے ہم معنی لفظ پہلے سے زبان میں موجود ہیں - لیکن مترادف الفاظ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ زبان میں اضافہ ہوجاتا ہے- اور زبان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک مدت کے استعمال کے بعد مترادف الفاظ کے مفہوم میں خود بخود ایسے نازک فرق پیدا ہوجاتے ہیں جس سے زبان کی لطافت بڑھ جاتی ہے اور وہ لفظ جو پہلے غیرضروری سمجھے جاتے تھے ضروری ہوجاتے ہیں- مثلاً ہماری زبان میں روٹی کا لفظ پہلے سے موجود ہے- فارسی میں نان کے وہی معنے ہیں جو ہماری زبان میں روٹی کے لیکن نان نے ہماری زبان میں آکر دوسری حیثیت اختیار کرلی اور وہ ایک خاص قسم کی روٹی ہو گئی، اسی طرح ”پاؤ،، (پان) پرتگالی لفظ ہے جس کے معنی روٹی کے ہیں - فرانسیسی میں اسے ”پان،، کہتے ہیں - اردو میں یہ نان کے ساتھ مل کر نان پاؤ ہوگیا کہ جس کے معنی ایک نئی قسم کی روٹی کے ہیں -

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ بدیسی الفاظ سے زبان

بھدی اور بوجھل ہوجاتی ہے۔ وہ لفظ جو غیر زبان میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں اور ان کی اجنبیت بالکل جاتی رہتی ہے اور ان میں اور دیسی لفظوں میں کوئی فرق نہیں رہتا اس لئے وہ زبان پر بار نہیں ہوتے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لفظ زبردستی گھس آتے ہیں یا بعض ادیب اپنے زور سے انہیں گھسیٹ لاتے ہیں۔ چونکہ ان میں میل جول کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے وہ اجنبی کے اجنبی رہتے ہیں اور کوئی انہیں منہ نہیں لگاتا۔ کچھ دنوں بعد بیزار ہوکر خود بخود نکل جاتے ہیں۔

انسانی خیال کی کوئی تھاہ نہیں اور نہ اس کے تنوع اور وسعت کی کوئی حد ہے۔ زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپور ہو خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک فرقوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں قاصر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادا کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے جاتے ہیں۔ مترادف الفاظ یا الفاظ کی کثرت ایسے موقع پر بہت کام آتی ہے۔ مترادف الفاظ سب ہم معنی نہیں ہوتے۔ ان کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ادائے مطلب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ خاص کر شاعری کے اغراض کے لئے مترادف الفاظ کا کثرت سے ہونا بہت کام آتا ہے۔ شاعر ان کے ذریعے سے لطیف سے لطیف خیال اور نازک سے نازک جذبات

کو ادا کر سکتا ہے پھر اسے ردیف و قافیے کے لئے بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

ادیب اور شاعر کے لئے لفظ کا انتخاب بڑی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ ایک برمحل صحیح لفظ کا انتخاب کلام میں جان ڈال دیتا ہے۔ مخلوط زبان میں انتخاب کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔

۴۔ اگر ہم کسی خیال یا ایجاد یا پیداوار کا بدیسی نام اپنی زبان میں نہیں لینا چاہتے تو اس کے لئے ہمیں خود اپنی زبان کا کوئی لفظ گھڑنا پڑے گا۔ ایسے لفظ عموماً مرکب بنانے پڑتے ہیں کیوں کہ مفرد لفظ پہلے سے کسی نہ کسی مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی زبان کے مرکب لفظ میں یہ فائدہ ضرور ہے کہ اس کا کوئی جز ایسا ہوتا ہے جس سے مفہوم کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن اگر کثرت سے مرکب لفظ بنائے گئے تو زبان کے بوجھل اور بھدی ہونے کا اندیشہ ہے۔ البتہ علمی اصطلاحات کے وضع کرنے میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایسے سہل لفظ جیسے گیس، آکسیجن وغیرہ کو بلا تامل اختیار کر لینا چاہئیے۔ لیکن ان جبڑا توڑ ناقابل تلفظ لاطینی اور یونانی سے بنائی ہوئی اصطلاحوں کے لئے جو ہمارے لئے معمے اور چیستان کا حکم رکھتی ہیں، ہمیں اپنے لفظ بنانے پڑیں گے اور وہ اکثر مرکب ہوں گے۔ مگر یہ سائنس اور علم

کی بعض شاخوں تک ہوگا۔ عام ادب میں اس بدعت کی اجازت نہ ہوگی۔

اگر زبان کی قدر و منزلت کا اندازہ ان مقاصد کے پورا کرنے میں ہے جن کے لئے زبان بنی ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو زبان کو غیر زبانوں کے الفاظ کے داخل ہونے سے بے انتہا فائدہ پہنچا ہے۔ عوام کی زبان جسے آج کل کھڑی بولی کہنے لگے ہیں اور جس پر اردو کی بنیاد ہے اس قدر محدود تھی کہ اگر اس میں فارسی زبان کا عنصر شریک نہ ہوتا تو وہ کبھی علم و ادب کے کوچے سے آشنا نہ ہوتی، اور اس وقت جو اردو میں اظہار خیال کے نئے نئے ڈھنگ پیدا ہو گئے ہیں اور طرز بیان میں لچک، تنوع، لطافت اور نزاکت آ گئی ہے وہ ان سے محروم رہتی۔ (تلخیص الاردو ص ۳۷۸-۳۹۷)

جب لفظ ہماری زبان میں آگیا اور رس بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا، ہمارا ہوجاتا ہے۔ اسے اگر ہم نکال دیں تو سوائے ہماری زبان کے اس کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ دوسری زبان میں مل جانے سے نہ اس کی وہ پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت، وہ اگر اپنی اصلی زبان کی طرف جائے گا تو پہچان بھی نہ پڑے گا اور کوئی اسے وہاں گھسنے نہ دے گا۔ (خطبات ص ۱۱۰-۱۱۱)

ہماری زبان اگر زندہ زبان ہے تو اس میں نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے خواہ وہ کسی زبان کے ہوں۔ اس سے کوئی زندہ زبان نہیں بچ سکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ مدت سے رائج چلے آرہے ہیں انہیں خارج کردیں اور ان کی جگہ ڈکشنریوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بے ڈول، بے ڈھنگے اور کرخت الفاظ داخل کردیں جن کے ادا کرنے میں زبان کئی کئی قلابازیاں کھائے اور کانوں کے پردے پھٹنے لگیں۔ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں خواہ کسی زبان کے ہوں وہ اب ہمارے ہیں، غیر نہیں۔ انہیں غیر سمجھ کر نکالنا سراسر حماقت ہے۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنی زبان کے دوست نہیں، دشمن ہیں۔

نئے لفظوں کے داخلے میں بھی زبان کی فطرت اور ذوق کو بڑا دخل ہے۔ اندھا دھند اور زبردستی لفظ داخل نہیں کیے جاسکتے۔ جو بندھ گیا ہے سو موتی، جو کھپ گیا وہ ہمارا اور جو نہیں کھپا وہ غیروں کا غیر۔ (خطبات ص ۳۶۴)

ایک زندہ زبان کے لئے لازم ہے کہ اس میں نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہے ورنہ وہ ایک روز مردہ ہوجائے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لغات میں سے بھدے، بے ڈھنگے اور ثقیل الفاظ چن چن کر بھردئے جائیں۔ ہر زبان کی ایک فطرت اور ساخت ہوتی ہے اور جب تک لفظ اس کے سانچے مین نہیں ڈھلتا، قابل قبول نہیں ہوتا۔ (خطبات ص ۳۰۴)

رسم الخط

تحریر کا ارتقاء عجیب و غریب ہے۔ اول اول انسان نے بول چال کے لئے اشاروں سے کام لیا۔ اس کے بعد کچھ ایسی آوازیں اور علامتیں مقرر کیں جس کے ذریعے سے وہ ایک دوسرے کی باتیں سمجھ سکیں۔ لیکن آواز، اشاروں اور علامتوں کے ذریعے اسی سے بات چیت کی جا سکتی ہے جو سامنے ہو یا اتنے فاصلے پر ہو کہ آواز پہنچ سکے یا اشارہ نظر آسکے۔ حالات اور ضرورت نے ایک مدت کے بعد تصویروں کے ذریعہ اظہار خیال کی تدبیر سمجھائی۔ مثلاً اگر کتا بنانا ہو تو کتے کی تصویر بنا دیتے۔ یا مرد یا عورت کو بتانا ہو تو مرد یا عورت کی تصویر بنادی جاتی۔ اس کے بعد دوسرا درجہ تصویر ہی کے ذریعہ خیال ظاہر کرنے کا تھا۔ مثلاً دو ہاتھ ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں۔ اس سے بظاہر تو یہ معلوم ہوگا کہ ایک کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ یہ خیال بھی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ایک شخص دوسرے شخص سے مصافحہ کر رہا ہے، یا ایک دوسرے کو خوش آمدید کہ رہے ہیں۔ یا ایک شخص دوسرے شخص سے کچھ معاہدہ

کر رہا ہے۔ یہ تصویری خط تھا ۔ ایک تو اس میں غلطی اور غلط فہمی کا بڑا اندیشہ تھا ، دوسرے ہر قسم کے خیالات اور جذبات ادا نہیں ہو سکتے تھے ۔

صدیوں کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ تصویر آواز کی قائم مقام ہو گئی۔ وہ شخص بہت ہی عالی دماغ اور بنی نوع انسان کا بڑا محسن تھا جسے سب سے اول یہ بات سوجھی ۔ یہ کیوں کر ہوا ؟ یہ ظاہر ہے کہ لفظ (یعنی شے کا نام) تصویر کی صورت میں تھا ۔ اس کے بولنے میں کئی آوازیں ملی ہوئی منہ سے نکلتیں۔ اس موجد نے یہ کیا کہ جو آوازیں نام کے لینے میں منہ سے نکلتی تھیں ان میں سے پہلی آواز کو تصویر کا قائم مقام کر دیا ۔ یعنی تصویر تو کسی نہ کسی صورت سے وہی رہی لیکن وہ آواز کی قائم مقام ہو گئی ۔ اور تصویر کی صورت بھی زمانہ سے بدلتے بدلتے وہ ہو گئی جو اب حروف کی ہے ۔ مثلاً الف کے معنی بیل یا بیل کے سر کے ہیں۔ چونکہ اس لفظ کی پہلی آواز ”آ“ ہے اس لئے اب یہ لفظ اس آواز کا قائم مقام ہو گیا ۔ اسی طرح لفظ بیت ہے ، جس کے معنی گھر کے ہیں ۔ اسے تصویر میں اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ ایک چار دیواری بناتے اور دروازوں کے سامنے ایک شخص بیٹھا ہوتا ۔ اب اس چار دیواری کی صرف نیچے کی دیوار یعنی لکیر رہ گئی ہے اور شخص کے بجائے نقطہ رہ گیا ۔ یہ ہماری ”ب“ ہے جو بیت کی پہلی آواز ”ب“ کی قائم مقام ہے ۔ یہی حال ”ج“ کا ہے ۔ جمل کے معنی اونٹ کے ہیں ۔ اگر شتر سوار اونٹ

کی نکیل اپنی طرف کھینچے تو اس کے سر اور گردن کی صورت "ج" کی ہو جائے گی جو لفظ جمل کی پہلی آواز ہے۔ اور شتر سوار "ج" کے پیٹ میں نقطہ ہے۔ غرض یہی ہمارے تمام حروف کی حالت ہے۔ ہماری ابجد مثل فارسی اور عربی ابجد کے سامی ہے، اور اہل فنیشیا کی ایجاد ہے۔ یہی ابجد یونان و روما اور دیگر ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں پہنچ گئی۔

اس بیان سے میرے کہنے کا یہ مقصد ہے کہ یہ حروف درحقیقت الفاظ یعنی اشیاء کے نام تھے، جو اب آواز کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ ان آوازوں یعنی حروف سے ہم طرح طرح کے لفظ بناتے ہیں۔ ابتدا میں ان الفاظ کے حروف الگ الگ لکھے جاتے تھے جیسا کہ اس وقت رومن رسم الخط لکھے جاتے ہیں۔ یہ رسم الخط زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے۔ ہمارا رسم الخط تحریر کی آخری ارتقائی صورت ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ حروف کو ملا کر ایک لفظ بنایا جاتا ہے جو تصویر کی طرح ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جب ہم کسی عبارت کو پڑھتے ہیں۔ تو اس کے الفاظ کے ایک ایک حرف کو دیکھ کر نہیں پڑھتے بلکہ پورے لفظ کو ایک دم پڑھ جاتے ہیں۔ جیسے ہم کسی تصویر کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں۔ ("قومی زبان"، یکم مارچ ۱۹۶۱ع)

دنیا کا کوئی رسم خط کامل نہیں اور ہم بھی یہ

دعوا نہیں کر سکتے کہ ہمارا رسم خط بے عیب ہے۔ ہر زندہ زبان اور زندہ شے میں تغیر و تبدل اور اصلاح کا ہونا لازم ہے ۔ البتہ مردے میں کسی تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہوتی کیوں کہ نمو کا اس میں امکان ہی نہیں ۔ اگر ہم اپنے رسم خط کا سراغ لگاتے لگاتے اس ابتدائی صورت تک پہنچیں جہاں سے اس نے آگے بڑھنا شروع کیا اور پھر اس طرف سے چلیں اور ہر قرن اور ہر عہد کے رسم خط کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہر عہد میں تغیر ہوتا گیا ہے اور جب ہم موجودہ رسم خط تک پہنچیں گے اور اس کا مقابلہ ابتدائی صورت سے کریں گے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوگا ۔

یہ فرق کیوں ہوا اور کس نے پیدا کیا؟ زمانے کے حالات اور خود ہماری ضرورتوں نے ۔ ہمیں اصلاح سے کبھی منہ موڑنا نہیں چاہئیے اور اس کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہئیے ۔ (خطبات ص ۵۹)

رسم الخط کا مسئلہ

رسم الخط کا مسئلہ آج کل بہت زیر بحث ہے اور خاصا بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے ۔ اس میں مشکل یہ آپڑی ہے کہ جیسا ہمارے یہاں عام دستور ہے رسم الخط کو قومی تہذیب اور مذہب کا جز سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ لوگ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس پر

بحث کرنا ترک کردیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس رسم خط میں صرف کم ہوگا، وقت کم لگے گا، جگہ کم گھرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی اور جو دیکھنے میں بھی خوش نما ہوگا وہی مقبول ہو کے رہے گا۔ (خطبات ص ۴۱)

حیات و کائنات

مقصد زندگی

ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے، یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تونے کتنی اور کس کی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا تو یہ پوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچا۔ (چند ہم عصر ص ۲۳۱-۲۳۲)

اعمال انسانی

انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ رات دن سرگردان و حیران رہا، وہ آرزوئیں جن کی خاطر کھانا اور سونا حرام ہوگیا اور وہ کوششیں جن کے لئے اس نے اپنی جان تک کھپادی پانی کے بلبلے سے زیادہ

نا پائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں ، اور کچھ انھی کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور شاید ضمنی طور پر کئے گئے تھے ۔ انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے ۔ بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ کمال کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنہیں بقائے دوام ہو اور خلق خدا کو ان سے فائدہ پہنچے ۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا اور قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے ۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں ۔ لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنہیں بقا ہو جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں ۔ (چند ہم عصر ص ۱۰۶-۱۰۷)

انسانیت

محنت اور شوق سے علم و فضل حاصل ہوسکتا ہے، شاعر، ادیب، انشا پرواز بن سکتے ہیں ۔ اسی طرح محنت، فراست اور بعض اوقات سفارش اور جوڑ توڑ سے جاہ و ثروت، مال و دولت، نام وری اور شہرت حاصل ہوسکتی ہے ، اور بڑھتے بڑھتے قوم کی سرداری اور ملک کی فرماں روائی تک دسترس ہوجاتی ہے ۔ تاریخ کے اوراق الٹ جائیے، آپ کو ایسے جید عالم و فاضل، ادیب و شاعر، حکیم و فلسفی، بہادر سپہ سالار، نامور فاتح اور سلاطین ملیں گے جن کے

کار ناموں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ان میں کتنے تھے جن میں انسانیت بھی تھی۔

بنی آدم صدہا منزلوں اور دوروں سے گزر کر لاکھوں برس میں موجودہ رتبے کو پہنچا ہے جس پر آسے فخر ہے اور اپنے تئیں اشرف المخلوقات کہتا ہے۔ لیکن ابھی ہزاروں برس درکار ہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں انسان کہلاسکے باوجود لاکھوں برس کی جدائی کے اس نے اپنے اصل اور قدیم بزرگوں اور مورثون کو نہیں بھلایا ۔ ان کی یاد اس کے دل میں تازہ ہے اور ایسا سعادت مند ہے کہ اب بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں اسے ذرا حجاب نہیں ۔ چونکہ آسے عقل و دانش بھی عطا ہوئی ہے اس لیے وہ اپنے اوصاف میں آن سے ہزار گنا برتر و اشرف ہے۔ جیلی فش اور سلوتھ سے زیادہ کاہل، لومڑی سے زیادہ مکار، شیر اور تیندوے سے زیادہ خونخوار، سانپ سے زیادہ زہریلا اور ہوشیار ہے۔ لوگ بعض وقت حیران ہوتے ہیں کہ فلاں شخص سے جو ایسا اچھا اور مہذب ہے، ایسی نازیبا اور ناشایستہ حرکت کیسے سرزد ہوئی؟ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، انسان اضداد کا مجموعہ ہے۔ اس میں متضاد صفات پائی جاتی ہیں اور جن کو دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے، وہ اس قدیم دور کی یادگار ہیں جب کہ انسان بہیمیت کی گود میں پرورش پا رہا تھا اور باوجود غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقی کے وہ اب تک اپنے دل و دماغ کو ان آلائشوں سے پاک نہیں کر سکا جو اس زمانے

سے اس کے ساتھ لگی چلی آرہی ہیں - ابھی تک وہ پورا انسان نہیں ہے - وہ ذی عقل جانور ہے - وہ جس قدر بہیمیت اور درندگی کے خصائل کم کرتا جائے گا اسی قدر انسانیت کی منزل سے قریب ہوتا جائے گا - (خطبات ص ۵۴۰-۵۴۱)

انسانیت کی تلاش

میں اپنی زندگی میں سینکڑوں اشخاص سے ملا ہوں اور ملتا رہا ہوں ، ان میں عالم و فاضل بھی ہیں ، ادیب و شاعر بھی ہیں ، صاحب ثروت بھی ہیں اور مفکر و مجتہد بھی - لیکن ایسے دو چار ہی ملے جن میں انسانیت بھی ہے اوریہ وہ شے ہے جو بہت کمیاب ہے - (چند ہم عصر ص ۳۵۴)

جوہر انسانیت

اپنے کو مٹا کر دوسروں کی خدمت کرنا ہی جوہر انسانیت ہے - (چند ہم عصر ص ۲۲۴)

انسانیت کا معیار

ہم اپنا زیادہ وقت اور کمائی کا زیادہ حصہ حیوانیت اور بہیمیت میں صرف کرتے ہیں - ہم کپڑے تن ڈھکنے اور سردی گرمی سے بچنے کے لئے نہیں پہنتے بلکہ شیخی اور فیشن کے لئے اور اپنے کو معزز جتانے کے لئے بھی - ہم کھانا صرف زندہ رہنے اور صحت کی خاطر نہیں کھاتے بلکہ زیادہ تر مزے کی خاطر کھاتے ہیں ، جس سے صحت اور

زندگی دونوں برباد ہوجاتی ہیں - ہم میں کتنے ہیں جو انسانیت کی خاطر کام کرتے ہیں ، ایسا کام جس سے نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ دوسروں کو فائدہ پہنچے اور جسے ہم شوق اور محبت سے کریں - ہم کام اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں رہنے سہنے، کھانے پینے وغیرہ کا سامان ملتا رہے - اگر یہ مجبوری اٹھ جائے تو شاید ہزار میں سے ایک بھی کام کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو - حیوان بھی یہی کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کم ہوتی جاتی اور حیوانیت بڑھتی جاتی ہے یا شاید انسانیت کا معیار بدلتا جارہا ہے - (خطبات ص۵۰۱-۵۰۲)

انسان اور دنیا

کارزار دنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا - یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں ، سر بھی دینا پڑتا ہے - جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے پسپا ہوجانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اسے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہئیے - (چند ہم عصر ص ۱۹۸-۱۹۹)

سیرت

علم محنت اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے - عقل زندگی کے تجربوں سے آتی ہے - علم بغیر عقل کے کارآمد نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات نقصان رساں ہوتا ہے - سعدی نے سچ کہا ہے کہ ”یک من علم را دہ من عقل می باید“ اور

عقل بغیر علم کے اکثر غلط رستے پر لے جاتی ھے۔ علم اور عقل دونوں کے تعاون پر انسانی زندگی کا دارومدار ھے لیکن ایک چیز اور ھے جو ان سے بھی برتر اور افضل ھے۔ وہ انسان کی سیرت (یعنی کیرکٹر) ھے اس میں کچھ فطرت کا عطیہ ھوتا ھے جو پیدائشی ھے اور کچھ ماحول اور تعلیم و تربیت کا اثر۔ جہاں یہ نہیں وھاں علم و عقل دونوں بیکار ھیں۔

(رسالہ ''قومی زبان'' ۱۶مئی ۱۹۵۰ء)

اچھائی اور برائی

برے اتنے برے نہیں ھوتے اور نہ اچھے اتنے اچھے جتنا ھم سمجھتے ھیں۔ اکثر یہ ھوتا ھے کہ سوسائٹی اپنے برتاؤ سے بعض خود دار شخصوں کو برا بنا دیتی ھے، جیسے پولیس بعض شریفوں کو باغی اور ڈاکو بنادیتی ھے۔ نیک برتاؤ کرنے سے وہ بھی اچھے ھوجاتے ھیں اور بعض اوقات اچھوں سے بھی اچھے! کیوں کہ انہیں بدی کا بھی تجربہ ھوتا ھے جو نیکوں کو نہیں ھوتا۔ (خطبات ص ۴۴۵)

انسان اور تقاضائے عصر

ھر دور کا ایک تقاضا ھوتا ھے اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزار حیات میں سنبھلے رھنے اور کام یاب ھونے کے لئے ضروری ھے۔ (چند ھم عصر ص ۳۸۲-۳۸۳)

اخلاق

مذہب ہو یا دنیوی معاشرت، سیاسیات ہو یا دینیات، بغیر اخلاق کے چارہ نہیں۔ جب تک ان کی تہ میں اخلاق نہ ہو کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن قابل غور اور اہم سوال یہ ہے کہ اعلا اخلاق کی تعلیم کیوں کر دی جائے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اعلا اور پاکیزہ خیالات اس طرح متمکن ہوجائیں کہ دنیوی لالچ، خود غرضانہ خواہشات، دوستی اور مروت انہیں ڈانواں ڈول نہ کرسکے؟

بعض کا خیال ہے کہ صرف مذہبی تعلیم ہی سے اخلاق درست ہو سکتے ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ اخلاق کی کتابیں پڑھانے اور وعظ و پند کے ذریعے سے اخلاق سکھا سکتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ پہلا طریقہ حکم و فرمان پر مبنی ہے اور بہت طبائع اُسے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اور اس لیے اکثر محروم رہ جاتی ہیں۔ اور دوسرا طریقہ بے مزہ اور روکھا پھیکا ہے، خصوصاً نوجوان طبعتیں اُس سے بھاگتی ہیں اور واعظوں کے وعظ اور ناصحوں کی نصیحتیں رائگاں جاتی ہیں۔ ایک تیسری تدبیر اصلاح اخلاق کی صحبت ہے۔ بے شک یہ ایک کارگر اور موثر تدبیر ہے لیکن ہر کہیں اعلا اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے کامل نمونے کہاں نصیب ہوتے ہیں! علاوہ اُس کے کہ پہلے دو طریقوں میں دل کشی نہیں جو نصیحت کی تلخی کو کم کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے ایک اور کمی بھی ہے، یعنی ان سے بڑائی حاصل کرنے کا دلوں

میں ولولہ اور جوش پیدا نہیں ہوتا، اب صرف ایک ہی طریقہ باقی ہے جو موثر بھی ہے، دلکش بھی ہے اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرتا ہے اور ہر کہیں میسر آسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ان لوگوں کے حالات پڑھنے کے لیے دیے جائیں جنھوں نے دنیا میں ایسے بڑے بڑے کام کیے ہیں جو کبھی مٹنے والے نہیں، بشرطے کہ ان کا لکھنے والا اس گر سے واقف ہو۔ (مقدمات اول ص ۱۶۸ - ۱۶۹)

اخلاق سکھانے کے دو ہی موثر طریقے ہیں۔ ایک تو اچھی صحبت اور ماحول کے ذریعے، دوسرے ان برگزیدہ ہستیوں کے سوانح زندگی کے ذریعے سے جنھوں نے دنیا کی مخالفتیں اور سختیاں جھیل کر اپنے نفس کو مار کر تن من دھن سے اپنے ملک یا قوم کی خدمت کی اور اس کی خاطر اپنی ہر عزیز چیز کو قربان کردیا اور ایسے کام کر گئے جو کبھی مٹنے والے نہیں۔ یہ لوگ مرے نہیں، زندہ ہیں اور ہمیشہ اپنے بعد کی آنے والی نسلوں کی رہ نمائی کرتے رہیں گے۔ خالی وعظ اور نصیحت یا تنبیہ اور ہدایتیں کارگر نہیں ہوتیں۔ ایسی باتیں دل میں جڑ نہیں پکڑتیں بلکہ بعض طبائع پر اس کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ البتہ جو ڈھنگ شیخ سعدی رح، مولانا روم رح جیسے بزرگوں نے اختیار کیا وہ بہت دل آویز اور موثر ہے۔ وہ حکایت یا نقل کے پیرایے میں کہنے کی بات اس طرح کہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کوئی نصیحت یا تنبیہ کو رہا ہے اور اثر اس کا واعظوں کے وعظ اور ناصحوں کی

نصیحت سے کہیں زیادہ اور پائے دار ہوتا ہے۔ یہ بزرگ اس نفسیاتی گر کو خوب سمجھتے تھے۔ الہامی صحیفوں میں بھی بعض اوقات یہی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ آپ کو تعلیم کے دوران میں بہت سے ایسے موقعے آئیں گے جب کہ صاف صاف کہنا خلاف مصلحت ہوگا۔ اس وقت یہ طریقہ بہت کام دے گا۔ اس میں ایک راز یہ بھی ہے کہ جب کوئی بات اکھڑ پنے سے دوسرے کے مزاج یا جذبات کا خیال کیے بغیر پھٹ سے کہ دی جاتی ہے تو اکثر اوقات باوجودے کہ بات سچی بات ہوتی ہے، سننے والے کے دل میں بغاوت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن جب وہی بات اس پیرایے میں کہی جاتی ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو دل آزاری کی تلخی خوش گواری میں بدل جاتی ہے اور بات دل میں اتر جاتی ہے۔ (مقدمات اول ص ۳۹۷ - ۳۹۹)

میں نے بار بار اخلاق کی درستی پر زور دیا ہے۔ میں اس لیے اس پر اصرار کرتا ہوں کہ ہمارے نظام تعلیم میں اس کی بڑی کمی ہے اور یہ بہت بڑا عیب ہے۔ اس لیے کہ جب کسی کے اخلاق گر جاتے ہیں تو اس کے اثر سے جسمانی اوردماغی قوا بھی زوال پزیر ہوجاتے ہیں۔ اخلاق ہی کا دوسرا نام نیکی ہے۔ نیکی کے بھی مدارج ہیں۔ اس کا فیصلہ کہ کون سی نیکی سب سے بڑی ہے یا کون سی نیکی دوسری نیکیوں پر ترجیح رکھتی ہے، کمروں میں بیٹھ کر منطقی دلیلوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر زمانے کے حالات اور ضروریات پر منحصر ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی وقت ملک میں قحط پڑ جائے تو اس وقت سب سے بڑی نیکی

بھوکوں کو کھانا کھلانا اور ان کی تکلیفوں کو کم کرنا ہوگی۔ یا خدا نخواستہ کبھی طاعون یا کوئی اور وبا پھیل جائے تو اس وقت بیماروں کی دوا دارو اور ان کی غور پرداخت بڑی نیکی ہوگی۔ یا فرض کیجئے کہ ملک میں جہالت ہے تو وہاں تعلیم کی اشاعت بڑی نیکی کا کام سمجھا جائے گا۔ (خطبات ص ۳۹۹-۴۰۰)

اخلاق اور تمدن

جب ہم قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوموں کے زوال کے زمانے میں ایسے ایسے شجاع، صاحب کمال، فن کار، صناع، ادیب، شاعر، فلسفی، حکیم پائے جاتے ہیں، جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس قوم میں ایسے صاحب کمال، ذی عقل اور فرزانہ اشخاص موجود ہیں وہ کیوں زوال کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم کے اخلاق گر جاتے ہیں تو کوئی قوت، کوئی تدبیر اسے زوال کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ عقل و حکمت ذہانت و ذکاوت، فن کا کمال کچھ کام نہیں آتا جب تک اخلاقی قوت ان کے ساتھ نہ ہو۔ اخلاق تمدن کی بنیاد ہے۔ اخلاق سے مراد صداقت، جرأت، ارادی قوت اور ایثار ہے۔ اخلاق میں ایثار کا درجہ سب سے اول ہے انسانی ترقی کے لیے ایثار لازمی شرط ہے۔ اولوالعزم قوموں کی تاریخ میں آپ کو ایسی ہستیوں کے نام ملیں گے جنھوں نے اپنی ہر

چیز کو قربان کر دیا ہے۔ سچی عزت اور عظمت انہی کا حق ہے۔ (خطبات ص ۳۹۲ - ۳۹۳)

تعلیم اور اخلاق

تعلیم گاہوں کا ماحول بدلنے کے لیے ہمیں ایسے ذی کمال اور صاحب اخلاق معلموں کی ضرورت ہے جو اپنے فن میں ڈوبے ہوئے ہوں، جن کے انہماک کی یہ حالت ہو کہ ان میں اور ان کے فن میں کوئی دوئی باقی نہ رہے۔ یہ صاحب کمال گو دنیاوی اعتبار سے ناقص انسان ہوتے ہیں، مگر یہ وہ لوگ ہیں جن سے انسانی تمدن اور ترقی کو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں اور یونی ورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے اہل کمال کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں۔ ان کے آنے سے ہماری تعلیم گاہوں کی فضا کچھ اور ہی ہو جائے گی۔ لیکن ایسے لوگ اخباروں میں اشتہار دینے سے اور درخواستیں طلب کرنے سے نہیں ملتے۔ وہ درخواستیں نہیں دیتے، سفارشیں بہم نہیں پہنچاتے، وہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے در بہ در نہیں پھرتے۔ ہمیں ان سے درخواست کرنی چاہئیے۔ ان کی عزت سے ہماری عزت اور علم کی عزت ہے۔ ہمیں ایسے استادوں کی ضرورت نہیں جنہیں علم سے زیادہ اپنی تنخواہ عزیز ہے اور جو شب و روز اپنی تنخواہوں کے اضافے اور ترقی کے لیے اپنے افسروں اور وزیروں کی دربار داری کرتے ہیں اور سفارشوں اور سرٹیفکٹوں کے بل پر ترقیاں حاصل کرنے کی دھن میں رہتے ہیں۔ اس میں علم کی بے وقری ہے۔ خود شاگردوں

کے دل میں ایسے استادوں کی عزت نہیں رہتی - وہ اس مغالطے میں نہ رہیں کہ طالب علم ان ترکیبوں کو نہیں سمجھتے - طالب علموں سے بڑھ کر کوئی استادوں کو نہیں سمجھتا - اگر استادوں کو کوئی ایسا موقع ملے کہ وہ شاگردوں سے اوجھل رہ کر اپنے شاگردوں کی رائیں اپنے متعلق سن سکیں تو انہیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ان کی رائیں باون تولے پاؤ رتی صحیح ہیں - (خطبات ص ۳۹۶-۳۹۷)

ذہنی قابلیت کے لیے تعلیم، با قاعدہ مطالعہ، مدارس کے معلم، یونی ورسٹی کے پروفیسر، کتب خانے، تجربے خانے، کتابیں، رسالے، اخبار، اپنے زمانے کے مروجہ خیالات مکتفی ہوتے ہیں - اگر معلم اور پروفیسر نہ بھی ہوں تو صرف کتابیں اس غرض کے لیے کافی ہوتی ہیں - لیکن اخلاق اور ذوق صلاحیت اس طرح حاصل نہیں ہوتی - کوئی شخص لکچروں سے نیک و بد اور حسن و قبح میں تمیز پیدا نہیں کرسکتا - ایک احساس ہے اور دوسرا جاننا، یہ دماغ کی دو مختلف کیفیتیں ہیں - ضابطے کی تعلیم جو عموماً امتحان پاس کرنے کرانے کی ہوتی ہے صرف ذہن تک پہنچتی ہے، اخلاق اور ذوق کا احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ ہمارے ماحول میں بسا ہوا ہو اور ہمارے روز مرہ کی زندگی کا جز بن گیا ہو -

محض ذہنی قابلیت بے کار ہے - اس کے سوا کچھ اور بھی درکار ہے اس کی تکمیل اخلاقی احساس، عزم، قوت

فیصلہ اور تخیل سے ہوتی ہے۔ جو لوگ علم پر قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں بڑی کڑی تیاری اور سخت جفا کشی کی ضرورت ہے۔ یہ زاہد کا سا زھد اور صوفی کی سی توجہ چاہتی ہے۔ اصل مقصد تک پہنچنے کے لیے اخلاقی قوت لازم ہے۔ اسی قوت سے فرض شناسی اور ذمے داری عطا ہوتی ہے۔ (خطبات ص ۲۰۳-۲۰۴)

علم

علم ہی ایک ایسی چیز ہے جو نہ کسی کی وراث ہوسکتی ہے اور نہ کسی خاص فرقے کا حق ہوسکتا ہے۔ (مقدمات دوم ص ۱۸۶)

جدید تعلیم

اس زمانے میں زندگی کی ہر چیز مصنوعی اور تجارتی ہو گئی ہے، دوستی و محبت، اخلاق و مذہب، عصمت و عفت، علم و حکمت سب تجارتی ہیں۔ یہی تعلیم کا حال ہے۔ یہ بھی ایک تجارتی شعبہ ہو گیا ہے۔ آج کل دنیا میں مادیت کا اس قدر زور ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئی ہے۔ اخلاق و مذہب اور روحانیت سب پس پشت جا پڑے ہیں۔ جدید تمدن سراسر مادی ہے جو انسان نے اس لیے اختیار نہیں کیا کہ وہ اس کے مزاج اور فطرت کے مطابق ہے بلکہ مشینی اور سائنسی ایجادات اور مادی ترقی کے سیلاب نے سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور وہ اس میں بے تحاشا بہتا ہوا چلا گیا ہے۔ ہوسناکی' مال و زر کی محبت، جنسی خواہشات میں بڑے چھوٹے (الا ماشاء اللہ)

سب مبتلا ہیں ۔ جدید نفسیات کی رو سے جنسی یا دوسری مذموم خواہشات کو روکنا ناجائز قرار دیا گیا ہے ۔ نفس آزاد ہے ۔ صبر و سکون ، ضبط و تحمل راندۂ درگاہ ہیں ۔ تعلیم کی ہر طرف پکار ہے ۔ مدرسوں اور کالجوں کا شمار بڑھتا جاتا ہے ، طالب علموں کی تعداد روز افزوں ہے ، کتب خانوں ، کتابوں ، رسالوں اور اخباروں کی ریل پیل ہے ۔ لیکن ادبی ذوق اور مطالعے کا شوق پہلے سے کم ہے ۔ یہ نہیں کہ لوگ پڑھتے نہیں ، بہت پڑھتے ہیں لیکن گھٹیا قسم کی کتابیں ، ادنا درجے کے ناول اور افسانے ، رسالے ہوس ناکی اور شہوانی جذبات کے ابھارنے والے زیادہ مقبول ہیں ۔ ایسی تعلیم جو اخلاق و مذہب اور روحانیت سے خالی ہے ایسے انسان نہیں پیدا کر سکتی جن کی اس وقت قوم کو ضرورت ہے ۔ اس تعلم کی پیداوار آپ کے سامنے ہے ، حکومت سے لے کے نیچے تک ہر طبقے پر نظر ڈالیے اور دیکھئے وہ کس رنگ میں ہیں ۔ جن خرابیوں اور بد اخلاقیوں کو آپ دیکھتے اور سنتے ہیں ان سے کہیں زیادہ ان خرابیوں اور بد اخلاقیوں کی تعداد ہے جو ہمارے سننے اور دیکھنے میں نہیں آتیں ۔ اس میں ان کا قصور نہیں ۔ ان کو تعلیم ہی ایسی دی گئی ہے جس میں نیک و بد ، نفس پرستی اور ایثار ، خود غرضی اور خدمت خلق میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ۔ ان کو صحبت ہی ایسی ملی ہے جہاں سب ایک حمام میں ننگے نہا رہے ہیں ۔ یہ جدید تعلیم کی آزادیاں ہیں ۔ (خطبات ص ۳۹۳ - ۳۹۴)

علم اور ذوق صحیح

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو، صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ (چند ہم عصر ص ۳۰۰)

تعلیم کا مقصد

تعلیم یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرے۔
(چند ہم عصر ص ۶۱)

یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔
(چند ہم عصر ص ۵)

وقت کا تقاضا

اس وقت ہمارا کام صبر و استقلال سے میدان صاف کرنا، داغ بیل ڈالنا اور نیو کھودنا ہے اور فرہاد وار شیرین حکمت کی خاطر سنگلاخ پہاڑوں کو کھود کھود کر جوئے علم لانے کی سعی کرنا ہے۔ اور گو ہم نہ ہوں گے مگر ایک زمانہ آئے گا جب کہ اس میں علم و حکمت کے دریا بہیں گے اور ادبیات کی افتادہ زمین سر سبز و شاداب نظر آئے گی۔ (مقدمات دوم ص ۲۱۱)

انسانی ترقی اور اشاعت علم

جہالت کے معنی اب لا علمی کے نہیں بلکہ اس میں

افلاس، کم ھمتی ، تنگ دلی ، کوتہ نظری ، بے غیرتی ، بد اخلاقی سب کچھ آجاتا ھے ۔ جہالت کا مقابلہ کر کے اسے پسپا کرنا سب سے بڑا کام ھے ۔ انسانی دماغ کی ترقی علمی ترقی ھے ، انسانی ترقی کی تاریخ علم کی اشاعت و ترقی کی تاریخ ھے ۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک انسان نے جو کچھ کیا ھے ، اگر اس پر ایک وسیع نظر ڈالی جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ جوں جوں علم میں اضافہ ھوتا گیا، پچھلی غلطیوں کی صحت ھوتی گئی، تاریکی گھٹتی گئی ، روشنی بڑھتی گئی ، انسان میدان ترقی میں قدم آگے بڑھاتا گیا ۔ (مقدمات دوم ص ۲۰۹)

علوم و فنون اور عوام

اس زمانے میں جب کہ الہی حکومتیں تک عوام کی ھوگئی ھیں تو کیوں علوم و فنون خاص فرقوں کے ھاتھ میں رھیں اور عام نہو جائیں ۔ (مقدمات دوم ص ۱۸۷)

قوموں کا عروج و زوال

ھمارے گاؤں سے ذرا فاصلے پر املی کا ایک پرانا درخت تھا ۔ بہار کے موسم میں ھرا بھرا ھو جاتا اور بڈھے پیڑ پر جوانی کی بہار آجاتی ۔ یہ بڑا مسافر نواز تھا ۔ تھکے ماندے مسافر اور راہ چلتے اس کے سائے میں دم لیتے ۔ کبھی کبھی کوئی کارواں یا بنجاروں کا ٹانڈا بھی اسکے نیچے آکر ٹھیر جاتا ۔ پاس کے جوھڑ میں نہاتے دھوتے اپنے جانوروں کو پانی پلاتے، خود آگ سلگا کر چولھے

بناتے، کھانا پکاتے اور کھا پی کر سو جاتے اور تڑکے سویرے اپنا سامان بیلوں پر لاد کر کوچ کرجاتے۔ گاؤں کے لڑکے بالے شام کو کبڈی یا کوئی دوسرا کھیل کھیلتے اور اندھیرا ہونے پر گھر واپس چلے جاتے۔ چاندنی راتوں میں یہ کھیل رات کو بھی جاری رکھتے۔ گاؤں کے مکھیا بھی کبھی کبھی اس کے سائے میں آکر بیٹھتے اور گاؤں کے معاملات پر مشورہ کرتے۔ جب اس میں پھول آتے اور پھل لگنا شروع ہوتے تو بچے پتھر مارکر گراتے اور کھٹے چوک کٹارے مزے لے لے کر کھاتے۔ گاؤں کے کہن سال بڈھوں کا کہنا تھا کہ ہمارے باپ دادا کہتے تھے کہ ہمارے وقتوں میں بھی یہ درخت ایسا ہی تھا، نہ معلوم اس نے گاؤں کی کتنی نسلیں دیکھی تھیں۔ غرض یہ درخت گاؤں والوں کو بہت عزیز تھا، دوسرے گاؤں والے اس گاؤں کا اتا پتا بتاتے وقت اسی کا نشان دیتے۔

ایک دن رات کو گیارہ بجے کے بعد اس زور کی آندھی چلی کہ سارے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کے چھپر اڑ گئے، ٹین کی چھتیں بھی اکھڑ کر دور جا پڑیں، غریبوں کے جھونپڑوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ کئی گھروں میں آگ لگ گئی۔ بچے ڈر کے مارے چارپائیوں کے نیچے گھس گئے، بڑے بوڑھے دعائیں مانگنے لگے۔ رات بری طرح جاگتے کٹی۔ پانچ بجے کے قریب خدا خدا کرکے آندھی تھمی، اب گھروں سے باہر نکل کر گاؤں کا حال دیکھا تو لوگوں کو بہت دکھ ہوا اور گھر گھر جاکر ایک ایک کی خیریت

دریافت کی۔ اب آگے بڑھے تو یہ دیکھ کر انہیں بہت صدمہ ہوا کہ ان کا پرانا درخت جس نے ان کے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں زمین پر اکھڑا پڑا ہے، اس وقت اپنا دکھ بھول گئے اور سب اس کا ماتم کرنے لگے، اب انہیں اس کی قدر ہوئی، سب کے سب آندھی کو برا کہنے لگے اور عورتوں نے کوسنے دینے شروع کئے۔

چھوٹے بڑے سب آندھی کو برا کہ رہے تھے اور روتے جارہے تھے۔ کیا سچ مچ سارا قصور آندھی کا تھا؟ اگر یہ بات ہے تو چوپال کے پاس نیم کا درخت اچھا خاصا کھڑا ہے وہ کیوں نہیں گرا۔ اور بھی کئی درخت ہیں رات بھر آندھی کی چوٹیں سہتے رہے، گرے نہیں، صحیح و سلامت ہیں۔ ہم آندھی کو تو دوش دیتے ہیں پر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ بزگوار، جن کی عمر سو سے کم تو کیا ہوگی کچھ زیادہ ہی ہو تو ہو، عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے، ان کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی تھیں، آندھی کے تھپیڑے جو پڑے، اوندھے منہ زمین پر آرہے

یہی حال قوموں کا ہے۔ جب کسی قوم کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں، نفسانیت اور خود غرضی عام ہوجاتی ہے، لوگ اپنی ذات کو مقدم سمجھنے لگتے ہیں، قوم کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے سے بالکل نہیں ہچکچاتے۔ اقتدار اور زر کی ہوس میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ ناجائز سے ناجائز ذرائع بھی استعمال کرنے میں باک نہیں ہوتا۔ ہوس کے بندے اور اقتدار کے بھوکے سب

کچھ گوارا کر لیتے ہیں - لیکن یہ کسی طرح گوارا نہیں کرتے کہ ان کے اقتدار پر آنچ آئے، وہ خلق خدا کو لوٹ لوٹ کر اپنے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گھر بھرتے ہیں، بد اعمال اور بد کرداری کا دور دورہ ہوجاتا ہے، انصاف اٹھ جاتا ہے، حق گوئی، اخلاقی جرأت اور قوت ایمانی باقی نہیں رہتی - ملک میں نفاق و انتشار پیدا ہو جاتا ہے، زندگی دشوار ہوجاتی ہے - قوم میں ضعف آجاتا ہے - اس کی جڑیں املی کے اس درخت کی طرح کھوکھلی ہوجاتی ہیں جو آندھی کے جھونکوں سے اکھڑ کر زمین پر آرہا تھا - زوال ہمیشہ اندر سے پیدا ہوتا ہے، باہر سے نہیں آتا - جب بداعمالی کی وجہ سے اندرونی حالت میں ضعف، انتشار، نفاق اور اقتصادی زبوں حالی پیدا ہوجاتی ہے تو ملک بیرونی آفات کا مقابلہ نہیں کر سکتا - معمولی سا حملہ بھی اسے مغلوب اور پامال کردیتا ہے - بعینہ جیسے کسی انسان کے قوا مضمحل اور ضعیف ہوگئے ہوں اور اعصاب از کار رفتہ ہوں - معدہ ٹھیک کام نہ کررہا ہو تو مرض کی مدافعت نہیں کرسکتا اور معمولی سی بیماری بھی اسے ختم کر سکتی ہے - (رسالہ قومی زبان مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۹ء ص ۳ تا ۵)

دنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادہ تقریباً مفقود ہوجاتا ہے، تخیل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہوجاتی ہے، علم کا دار و مدار چند رسمی

باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہے۔ اس وقت قوم یا تو بے کار اور مردہ ہوجاتی ہے یا سنبھلنے کے لئے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ (مقدمات دوم ص ۲۰۱)

عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہوگیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

(چند ہم عصر ص ۲۲۵)

مساوات کا عجیب مفہوم

زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کام یابی کو نہیں دیکھ سکتے، وہ بڑھتے ہوئے کو بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں انہیں خوشی ہوتی ہے۔ کبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھتے ہی سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضا ہے۔ (چند ہم عصر ص ۱۹۷)

بیرونی وسائل اور قومی ترقی

کسی ملک یا کسی قوم میں طبعی طور سے اعلا قابلیت کا ہونا ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور وجہ سے اپنے آپ کو بیرونی اثر سے الگ اور محفوظ رکھنا چاہے گی اور صرف اپنے اندرونی وسائل اور ذرائع سے بڑھنے کی کوشش کرے گی تو اس کی ترقی شاہ راہ تمدن پر بہت سست ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اس نے بیرونی وسائل سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں اعلا ترقی کی ہو۔ (چند ہم عصر ص ۲۱)

عظمت کی علامت

اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔ (چند ہم عصر ص ۱۳)

پائیدار عظمت

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہوجاتے ہیں، بہت سے ہیں جنہیں اتفاقات زمانہ نے بڑا آدمی بنادیا ہے۔ بہت سے ہیں محض نام و نمود کے لئے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ لیکن کم ہیں جو اپنی لیاقت اور محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔ (چند ہم عصر ص ۱۰۸)

اسلاف کی غلطیاں

جس طرح پچھلوں کے کام اگلوں کے حق میں مفید ہوتے ہیں اسی طرح ان کی غلطیاں کچھ کم مفید نہیں ہوتیں تاکہ آنے والے ان سے بچیں اور ان کا اعادہ نہ کریں - (خطبات ص ۳۰)

کامیابی

کام یا.بی آسمان سے نہیں آترتی ، یہ سب محنت ، صبر ، استقلال کی کرامات ہے - جانیں کھپانی پڑتی ہیں تب کچھ ھاتھ آتا ہے ع

ھر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاھد
بہت جانچ لیتے ھیں دیتے ھیں تب کچھ

(خطبات ص ۲۷)

لذت کار

کام اور محنت کرنے ھی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے ، اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاق قوا کی جلا ھوتی ہے- اس سے مراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق اسے اور ابھارے، ورنہ کام کام نہیں رھتا بیگار ھوجاتی ہے - (چند ھم عصر ص ۳۲۶)

قومی لباس

قومی لباس کا ایک ھونا قوسی یگانگت اور اتحاد کے لئے ایسا ھی ضروری ہے جیسے زبان اور مذھب کا ایک ھونا - (چند ھم عصر ص ۲۰۸)

تباهی کے اسباب

انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں، بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔ (چند ہم عصر ص ۱۲۹)

مطالعه

پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ مطالعہ ایک شریفانہ فعل ہی نہیں حکیمانہ فعل ہے، لیکن پڑھنے پڑھنے میں فرق ہے۔ اور کتاب کتاب میں فرق ہے۔

میں ایک بدمعاش اور پاجی آدمی سے باتیں یا بے تکلفی کرتے ہوئے جھپکتا ہوں اور آپ بھی میرے اس فعل کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں اس سے زیادہ بری، بدمعاش اور پاجی کتاب پڑھتا ہوں، نہ آپ کو ناگوار گذرتا ہے اور نہ مجھے ہی کچھ ایسی شرم آتی ہے بلکہ اس کی بات شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اترتی چلی جاتی ہے۔ پاجی آدمی کی تو شاید کوئی حرکت ناگوار ہوتی اور میں اس سے بے زار ہو جاتا مگر یہ چپکے چپکے دل میں گھر کر رہی ہے اور اسکی ہربات دلربا معلوم ہوتی ہے۔

اگر میں کسی روز بازار جاؤں اور چوک میں سے کسی محض اجنبی شخص کو ساتھ لے آؤں اور اس سے بے تکلفی اور دوستی کی باتیں شروع کردوں اور پہلے ہی روز اس طرح سے اعتبار کرنے لگوں جیسے کسی پرانے دوست پر، تو آپ کیا کہیں گے؟ لیکن اگر ریل کسی اسٹیشن

پر ٹھیرے اور میں اپنی گاڑی سے اتر کر سیدھے بک اسٹال (کتب فروش کی الماری) پر پہنچوں اور پہلی کتاب جو میرے ھاتھ لگے وہ خرید لاؤں اور کھول کر شوق سے پڑھنے لگوں تو شاید آپ کچھ نہ کہیں گے، حالانکہ یہ فعل پہلے فعل سے زیادہ مجنونانہ ھے۔ اُس کے لیے تو کوئی عذر ھو بھی سکتا ھے، مگر اس کے لیے کوئی عذر ممکن نہیں۔

میں ایک بڑے آباد شہر یا مجمع میں جاتا ھوں، کبھی ایک طرف نکل جاتا ھوں کبھی دوسری طرف جا پہنچتا ھوں اور بغیر کسی مقصد کے ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ھوں۔ افسوس کہ باوجود آدمیوں کی کثرت کے میں وھاں اپنے تئیں اکیلا اور تنہا پاتا ھوں اور اس ھجوم میں تنہائی کا بار اور بھی گراں معلوم ھوتا ھے۔ میرے کتب خانے میں بیسیوں الماریاں کتابوں کی ھیں، میں کبھی ایک الماری کے پاس جا کھڑا ھوتا ھوں اور کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا ھوں اور کبھی دوسری الماری میں سے کوئی کتاب اٹھا کر دیکھنے لگتا ھوں۔ میں اس طرح سینکڑوں کتابیں پڑھ جاتا ھوں لیکن اگر میں غور کروں تو میں دیکھوں گا کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اس وقت میری آوارہ خوانی مجھے ستائے گی۔ اور جس طرح ایک بھرے پرے شہر میں میری تنہائی میرے لئے وبال تھی اسی طرح اس مجمع شرفا و علما، ادبا و شعرا میں میں یکہ و تنہا اور حیران ھوں گا۔

بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ھی نہیں مضر بھی

ہے۔ جس قدر ہم بغیر کسی مقصد کے پڑھتے ہیں اسی قدر ہم ایک با معنی مطالعہ سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

ملٹن نے ایک جگہ کہا ہے کہ "اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ایسا ہی ہے جیسے کسی انسان کا گلا گھونٹنا۔" جس سے اس کی مراد یہ ہے کہ فضول اور معمولی کتابوں کے پڑھنے میں عزیز وقت ضایع کرنا اچھی کتاب کا گلا گھونٹنا ہے کیوں کہ ایسی صورت میں وہ ہمارے لیے مردہ ہے۔

لوگ کیوں فضول، معمولی اور ادنا درجہ کی کتابیں پڑھتے ہیں؟ کچھ تو اس لئے کہ ان میں نیا پن ہے، کچھ اس خیال سے کہ ایسا کرنا داخل فیشن ہے اور کچھ اس غرض سے کہ اس سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پہلی دو وجہیں تو طفلانہ ہیں۔ تیسری وجہ البتہ بظاہر معقول ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم معمولی ذلیل اور ادنا معلومات کو اپنے دماغ میں بھرتے ہیں تا کہ اعلا معلومات کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگر ہم اپنے مطالعہ کا ایک سیاھہ تیار کریں اور اس میں صبح سے شام تک جو کچھ پڑھتے ہیں لکھ لیا کریں اور ایک مدت کے بعد اسے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہم کیا کر گزرے۔ اس میں ہم بہت سی ایسی تحریریں پائیں گے جن کا ہمیں مطلق خیال نہیں، بہت سے ایسے ناول ہوں گے جن کے هیروؤں تک کے نام یاد نہیں، بہت سی ایسی کتابیں جن کی نسبت اگر ہم سے کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ ہم پڑھ چکے ہیں تو ہمیں کبھی یقین نہ آتا، بہت سی ایسی تاریخیں

سفر نامے ، رسالے وغیرہ ہوں گے جنہیں پڑھ کر خوش تو کیا پچھتائے ہی ہوں گے ۔ اگر ہم علی گڈھ کالج کے طالب علموں کے نام، ان کے حلیے، ان کے وطن ' ان کے محلے ، ان کی کتب نصاب تعلیم اور شجرے یاد کرنے شروع کردیں اور اسے معلومات کے نام سے موسوم کریں تو لوگ کیا کہیں گے ؟ غرض ایسا ہی کچھ حال اس سیاحه کا ہوگا ۔ اس کا اکثر حصہ خرافات کی عجیب فہرست اور ہماری ورق گردانی اور تضیع اوقات و دماغ کی ایک عمدہ یادگار ہوگی ۔

ملٹن نے کہا خوب کہا ہے : " عمدہ کتاب حیات ہی نہیں بلکہ ایک لافانی چیز ہے ۔" اس قول میں مطلق مبالغہ نہیں ۔ عمدہ کتاب خود ہی لافانی نہیں بلکہ اپنے لکھنے والے کو ، آن کو جن کا اس میں ذکر ہے اور بعض وقت پڑھنے والوں کو بھی لافانی بنا دیتی ہے ۔ عمدہ کتابوں نے انسانوں کے اخلاق و طبائع و آراء پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے ، خیالات میں عظیم الشان تغیر پیدا کیا ہے ' قوموں میں هل چل اور انقلابات بپا کئیے ہیں اور ملکوں کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہے ۔ اور یہی عمدہ کتاب کی نشانی ہے ۔ (مقدمات اول ص ۱۶۳ - ۱۶۶)

بہترین مطالعه

دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لئے

سبق آموز ہوسکتی ہے - انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہے -

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

(چند ہم عصر ص ۱۲۴)

شہرت

ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضعف ہے" اور حقیقت میں سچ بھی ہے - اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنہیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوئی ہے اور جن کا علم و فضل تبحر کے رتبے کو پہنچ گیا ہے، ایسے بھی ہیں کہ شہرت پر لات مار کر کنج تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں، خواہ باد ہوائی کیوں نہ ہو، مگن ہیں - یا تو وہ اس ضعف کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کردیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر ہستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا بیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بد مذاقوں کی ھا ھا یا چند سمجھ داروں کی واہ واہ کے لئے کاغذ کو سیاہ اور لب کو وا کرنا گوارا نہیں کرتے - (چند ہم عصر ص ۷)

شہرت وہ بد بلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے - (چند ہم عصر ص ۱۶۸)

تحمل اور دولت

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی اصل ترقی دماغی

قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی روح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کی کھینچنے والی ہے۔ لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی، لیکن خدا نخواستہ اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی گئی تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ (چند ہم عصر ص ۹)

کمال

شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں۔ جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انہی دونوں کا خانہ زاد ہے۔ (چند ہم عصر ص ۱۲۳)

اچھی صحبت کا اثر

ماحول کا انسانی تربیت اور نشو و نما میں بڑا دخل ہے۔ ادنا ناسازگار ماحول اعلا سے اعلا دماغی صفات کو زائل کر دیتا اور اخلاق بگاڑ دیتا ہے اور ایک صالح ماحول یا صحبت انسان کو (بہ شرطے کہ اس میں صلاحیت ہو) کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ میں نے بعض ایسے ان پڑھ لوگ دیکھے ہیں جو اچھی صحبت کی بدولت اپنی گفتگو اور برتاؤ میں ایسے شایستہ اور مہذب معلوم ہوتے تھے کہ کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ ان پڑھ یا جاہل ہیں۔ (خطبات ص ۳۹۵)

امراء کی صحبت

امراء کی صحبت آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ (مقدمات دوم ص ۱۶۹)

محبت اور جبر

دو شخصوں کو مجبور کرنا کہ آپس میں محبت کرو ایک متضاد بات ہے۔ جہاں جبر ہے وہاں محبت کہاں اور جہاں محبت ہے وہاں جبر کی حاجت نہیں۔ ممکن ہے کہ بعضے یہ کہیں کہ اکثر بعد میں محبت پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ اتفاقی باتیں ہیں اور اتفاق پر بھروسہ کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ (مقدمات دوم ص ۱۹۹)

حکومت

حکومت کی کوئی صورت بری نہیں بشرطیکہ صحیح اصول کو پامال نہ کیا جائے۔ لیکن اگر صحیح اصول پر نظر نہیں تو حکومت کی ہر صورت خواہ قیاسی طور سے کیسی ہی اعلا کیوں نہ ہو مذموم ہے۔ (مقدمات اول ص ۲۰۴)

روایت پسندی

ہمارے اصول، عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلا اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے

جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچہ مر جاتا ہے تو بھی اسے جدا نہیں کرتی اور اپنے سینے سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو گل سڑ کر گرنے لگتا ہے۔ یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے کا ہوتا ہے۔ جب لوگ اپنے مرغوب رسم و رواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ خیر زمانے کی دست برد سے گل سڑ کے گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انہی کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ (خطبات ص ۶۴ - ۶۵)

نئی روشنی اور روایت پسند

یہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جب کبھی دنیا میں نئی روشنی جلوہ گر ہوتی ہے تو اس کے متعلق ان لوگوں کی رائے جو روایت و تقلید کے بندے ہیں، اتفاق سے صحیح ہو تو ہو ورنہ اکثر و بیشتر غلط اور نہایت غلط ہوتی ہے۔ علم و فضل اور درسی ذوق اسے جھٹلاتے ہیں، لیکن انسانی فطرت سے باخبر اور بنی نوع انسان کے ہمدرد اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ (مقدمات دوم ص ۶۰)

عمل

سوچنا اور غور کرنا بے شک ایک مبارک فعل ہے اور اہل دانش کا شیوہ ہے، لیکن سوچتے ہی رہ جانا اور

عمل کی طرف قدم نہ اٹھانا کاہلوں اور شیخ چلیوں کا کام ہے۔ شیخ چلی کوئی برا آدمی نہ تھا۔ اس میں تخیل بھی تھا اور سوجھ بوجھ بھی۔ اس کے منصوبوں میں کہیں منطقی ضعف نہیں پایا جاتا۔ صرف ایک کسر تھی کہ بے عمل تھا۔ اس لیے ناکام رہا اور بدنام ہوا۔ (خطبات ص ۲۰۶)

علم و فضل کا غرور بغیر عمل کے خالی ڈھول پیٹنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ (خطبات ص ۳۳۰)

حقیقی مسرت

جب کوئی اعلا مقصد پیش نظر ہوتا ہے تو زحمت اور قربانی اطمینان قلب کا باعث ہوجاتی ہے جو مسرت کا اصلی سرچشمہ ہے۔ (خطبات ص ۴۰۳)

غلطی

غلطی کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے، یہ ایک معمولی چیز ہے۔ غلطی سب کرتے ہیں، بڑوں بڑوں نے کی ہے۔ اولیاؤں اور پیغمبروں سے غلطیاں ہوئی ہیں اور غلطی وہی کرتا ہے جو کچھ کرتا بھی ہے، جو کچھ کرتا ہی نہیں وہ غلطی کیا کرے گا؟ اس کے علاوہ غلطیاں بھی ترقی کی ممد ہوتی ہیں۔ مثلاً پچھلوں کی غلطیاں آئندہ آنے والوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام دیتی ہیں اور پکار پکار کے کہتی ہیں کہ خبردار اس طرف نہ آنا۔ اسی طرح ہماری غلطیوں سے آئندہ نسلوں کو فائدہ پہنچے گا۔ کسی کام کے جانچنے کے لیے غلطی سے قطع نظر کرکے یہ دیکھنا چاہئے

کہ اس کے بعد کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے دماغ میں روشنی اور ہمارے فکر میں جولانی پیدا کرتی ہے۔
(خطبات ص ۴۳۵)

کاہلی

انسان فطرتاً کاہل معلوم ہوتا ہے۔ محنت کرنا نہیں چاہتا ۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں سوائے کاہل کے ۔ کاہلی جرم ہے، گناہ ہے، عطیۂ الٰہی سے انحراف اور کفران نعمت ہے۔ یاد رکھئے کہ جو اقوام یا افراد کام کرنے سے ہچکچاتے اور محنت سے جی چراتے ہیں انہیں کبھی آزادی نصیب نہ ہوگی ۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ غلام رہیں گے، اگرچہ ان کے ہاتھوں میں آزادی کے منشور کیوں نہ ہوں! کام سے انسانیت آتی ہے۔ سیرت اور اخلاق بنتے ہیں ۔ ظاہر و باطن کی اصلاح ہوتی ہے۔ ہم جان دینے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں مگر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے ۔ اس میں پتا مارنا پڑتا ہے، عزیز اشغال اور محبوب عادتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ (خطبات ص ۴۳۶-۴۳۷)

مخالفت

کسی تحریک کو ہم دردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی ہی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقویت کا راز بہت کچھ اس کی مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے، عملی قوت کو ابھارتی ہے اور انسان کے اُن جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے ۔ مخالفت در پردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور

کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی اور تحریک سو بسوے کام یاب ہوگی ۔ (خطبات ص ۲، ۵-۳، ۵)

وقت

دُنیا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتی، اس کی نیرنگیاں کبھی کم نہیں ہوتیں، اور ہمیشہ کسی نہ کسی نئے دور کا زور و شور رہتا ہے۔ اس زمانے میں بھی یورپ میں علم و حکمت کا وہ سیلاب آیا کہ اس نے پچھلے دوروں پر پانی پھیر دیا ۔ اس میں شک نہیں کہ جب کسی خاص زمانے میں کسی خاص طرف میلان ہوتا ہے تو اس میں مبالغہ بھی بے حد ہوجاتا ہے۔ لیکن حقیقت بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ اور اسی لئے انسان کی گذشتہ کوششوں کے مقابلہ میں اس خاص لحاظ سے بہت بڑی ترقی ہوجاتی ہے اور اس کے اثر سے بڑے بڑے تغیر اور انقلاب ہوتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کا بیر قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اب اس دور میں سائنس نے نیا چولا بدلا اور سارے عالم میں کھلبلی مچادی تو اول اول اہل مذاہب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کی عالمگیر اور حیرت انگیز ترقی دیکھ کر ششدر رہ گئے ۔ مگر پھر وہ سنبھلے اور سنبھل کر اپنے بچاؤ کی فکر کرنے لگے مگر یہ ترقی یافتہ اقوام کی حالت تھی ۔ لیکن وائے برآں قوم جس پر جہالت اور تعصب چھایا ہوا ہو، جس کے مجتہد اور مصلح اپنے مقتدیوں سے زیادہ ناواقف اور جاہل ہوں ! ہمارے علماؑ کی حالت اس

وقت اصحاب کہف کی سی تھی، وہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو وھیں سمجھ رہے تھے- جہاں وہ تھے زمانہ کا تغیر اور اس دور کی خصوصیت ان کی سمجھ ھی میں نہیں آتی اور آئے تو کیوں کر، جو یہ سمجھے کہ رات کو سویا اور صبح ہوتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا، اسے کوئی کیوں کر سمجھا سکتا ہے کہ اس اثنا میں کئی صدیوں کا پھیر پڑ گیا ہے اور زمانہ میں ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے۔
(مقدمات اول ص ٥-٦)

مذھب

مذھب کو منطق و استدلال سے اتنا تعلق نہیں جتنا کہ انسان کے جذبات لطیفہ یا وجدان قلب سے ہے اور اس لیے مذھب پر بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان رسمی قیود سے باھر نکل کر نظر ڈالے اور اس میں وہ جوش اور حرارت ہو جو ایک سرد مہر منطقی یا ایک کائیاں دنیا دار میں نہیں ہوسکتی۔ (مقدمات اول ص ٨-٩)

شوق و سعی

حصول علم کے شوق میں ایک اور بات بھی مضمر ہے جو سب سے زیادہ قابل قدر ہے۔ انسان کو انسان بنانے والی یعنی اس کا کیریکٹر سنوارنے والی جو شے ہے وہ شوق و سعی اور ریاضت و محنت ہے۔ خصوصاً جب کہ مدعا حصول اغراض نفسانی نہ ہو۔ ان لوگوں کے کیریکٹر میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے اور یہ صرف انہی لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کے دلوں میں کسی اعلا مقصد کے حاصل

کرنے کی لو لگی ہوتی ہے اور جو اس دھن میں دن کو دن سمجھتے ہیں اور نہ رات کو رات، مصیبت کو مصیبت خیال کرتے ہیں نہ راحت کو راحت، مگر راہ طلب میں برابر قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں اور آخر میں گوہر مقصد ہاتھ آئے یا نہ آئے مگر ایک ایسی چیز ہاتھ لگ جاتی ہے جو اس سے زیادہ نایاب اور اس سے کہیں بیش بہا ہے یعنی انسانیت یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ صفائی باطن۔
(مقدمات اول ص ۲۵۴-۲۵۵)

اچھا استاد

اچھا استاد دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے ہے۔
(مقدمات اول ص ۳۰۲)

ماضی حال اور مستقبل

انسان کسی قدر قدامت پسند واقع ہوا ہے، گزشتہ میں اسے وہ خوبیاں نظر آتی ہیں جو قریب ہونے کی وجہ سے حال میں نہیں دکھائی دیتیں۔ لیکن حال سے غفلت کرنا اپنے مستقبل سے غفلت کرنا ہے۔ (خطبات ص ۱۳)

شادی

کم زور دل و دماغ کے لوگ جو شادی کر لیتے ہیں ان میں سے اکثر مجنوں ہوجاتے ہیں اور بالفرض اگر مجنوں نہ بھی ہوں تو کیا یہ کم ہے کہ خود بیمار ہیں اور دوسروں کو بیمار رکھیں۔ اور چلتے وقت دنیا میں اپنی ایسی یادگار چھوڑ جائیں جو خود اپنے لئے نیز دوسروں کے لئے وبال

ہو - یہی حال بچپن اور بڑھاپے کی شادی کا ہے - پہلی ایک خوفناک کھیل ہے اور دوسری ایک شرمناک ہوس ہے - نتیجے دونوں کے خراب ہیں۔ ایک وقت سے اول ہے اور دوسری وقت کے بعد - اصل وقت شباب کا ہے جس کی بچے کو خبر نہیں اور بوڑھا جسے کھو چکا ہے اور مڑ مڑ کے حسرت کے ساتھ دیکھتا ہے، شادی کرکے جوان ہونا چاہتا ہے مگر جوانی کی بات کہاں ؟ (مقدمات دوم ص ۱۹۹ - ۲۰۰)

عالی دماغ شخصیتیں

عظیم الشان چیزیں گو وہ عملی لحاظ سے کیسی ہی ساکت اور صامت ہوں، لیکن صرف ان کے وجود ہی سے دنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہوسکتا - تاروں بھری رات میں جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا ؟ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب و غریب کیفیت پیدا نہیں ہوتی ؟ یہی حال ان وسیع نظر عالی دماغ لوگوں کا ہے، گو وہ کچھ نہ کہیں لیکن ان کا اثر نہایت پر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے - (چند ہم عصر ص ۱۰)

بڑا آدمی

بڑے شخص سے کیا مطلب ہے ؟ ایک صاحب جاہ و ثروت بھی بڑا شخص ہوسکتا ہے ایک عالی دماغ فلسفی بھی

بڑا شخص مانا جاسکتا ہے، ایک نازک خیال شاعر، ایک ماہر صناع، ایک عالم متبحر، ایک کامل سیاست دان، یہ سب بڑے شخص ہوسکتے ہیں، لیکن ہم جسے بڑا شخص مانتے اور سمجھتے ہیں وہ وہ ہے جو اپنے افکار اور اپنی زندگی سے دلوں میں ولولہ، دماغوں میں جلا اور خیالات میں انقلاب پیدا کردے اور ان کے طرز فکر ہی کو نہیں بلکہ ان کے دماغوں کی ساخت کو بھی بدل دے اور زندگی کا نیا تصور عطا کرے۔ قوم کو تاریکی سے نکال کر اجالے میں لے آئے اور پستی و ضلالت کی راہ سے موڑ کر اس رستہ پر لے آئے جسے ہم صراط مستقیم کہتے ہیں۔ (رسالہ قومی زبان۔ یکم مئی ۱۹۵۰ء ص ۶)

بڑے آدمی

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت انگیز جد و جہد، قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاق دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا اور ان کے پاس جو گیا کچھ بن

کر آیا۔ (ادبی تبصرے ص ٦٣)

بڑے آدمیوں کے وعدے

بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہی ہوتے ہیں، جو جتنا بڑا ہوتا ہے اس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ (چند ہم عصر ص ۲۱۲)

بڑے لوگوں کی صحبت

بڑے لوگوں کی صحبت بھی اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے۔ جو ان سے چھوا کندن بن گیا۔ (چند ہم عصر ص ۲۰۷)

تصوف

تصوف ہماری ادبیات، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبے میں رچا ہوا ہے (شاید ہماری سیاسیات بھی اس سے خالی نہیں ہے)، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لاش ہے جس میں روح کا نام نہیں اور جسے ہم صدیوں سے پیٹتے چلے آتے ہیں یا ایک شان دار درخت ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے۔ کہنے کو درخت ہے مگر صرف ایندھن کے قابل رہ گیا ہے۔ یا ایک خوب صورت اور نامور عمارت کا کھنڈر ہے جس کی تعریف کر دینا ہی ہمارے ذوق سلیم کی دلیل ہے۔ یا ایک قبر ہے جو اپنے پر عظمت گنبد کی وجہ سے بچ رہی ہے۔ بہت سوں نے اسے اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ پیشے کی بدولت بہت سی مقدس چیزیں کھیل تماشا بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ بھی محفل کے گرمانے کے لئے ایک لطیفہ ہو گیا

ہے۔ تصوف اب اس کا نام ہے کہ چند اصطلاحیں یاد کرلیں یا چند آسن یا ذکر رٹ لئے اور نہیں تو کم سے کم لباس ہی میں جدت پیدا کرلی۔ حسن و عشق کے چرچے میں جب کچھ مزا نہ رہا تو تصوف نے ہماری غزلوں میں چاشنی پیدا کردی۔ کسی شعر میں تصوف کی اصطلاح کا آجانا ہمیں وجد میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مایوسی اور ناکامی، غفلت اور کاہلی کا سہارا اب یہی رہ گیا ہے۔ اور کیا ستم ظریفی ہے کہ ریا کا دشمن خود ریا کے لباس میں جلوہ گر ہے! اور اب تو اس کی لے اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ شاید چند روز میں ہمیں اپنی یونی ورسٹیوں میں اس کے لئے کوئی ڈگری قائم کرنی پڑے۔ غرض تصوف ایک قسم کی روحانی منطق ہے جو لفظی داؤ پیچ اور مبہم بیانات کا مجموعہ ہو گیا ہے۔

(قدیم اردو ص ۳۸)

صوفی اور مولوی

صوفی صوف سے مشتق ہو یا صفا سے، وہ مذہبی اور اخلاقی عالم میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ملک و ملت سے بے نیاز ہے اور ہر قوم اور ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ وہ ایک قسم کا باغی ہے جو رسم ظاہر داری کو جو دلوں کو مردہ کردیتی ہے، روا نہیں رکھتا اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو۔ وہ لفظ کو دیکھتا ہے اور یہ معنی کو۔ وہ رسمیات اور تقلید

کا پابند ہے اور یہ ان سے بے زار - اس کی نظر برائی پر پڑتی ہے اور یہ برے سے برے میں بھی بھلائی کا پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے - وہ لعن طعن سے کام لیتا ہے اور یہ مہر و محبت سے - وہ سختی اور تشدد کرتا ہے اور یہ نرمی اور ملائمت - وہ بہت کم معاف کرتا ہے اور اس کا شیوہ درگذر کرنا ہے - وہ خودی اور خود نمائی سے بڑا بنتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری سے دلوں میں گھر کرتا ہے - وہ دوسروں کے عیوب کا متجسس رہتا ہے اور یہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے - وہ اپنے علم سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ اپنے عمل سے دوسروں کو لبھاتا ہے -

مولوی سب کو ایک لاٹھی ہانکتا ہے، لیکن صوفی ہر ایک کے رنگ طبیعت کو دیکھتا ہے اور جیسی جس کی طبیعت کی افتاد ہوتی ہے اسی ڈھنگ سے اس کی تربیت کرتا ہے اور اس میں بعض اوقات وہ شریعت سے تجاوز کرنے یا بعض ارکان و اصول کے ترک کرنے میں بھی مضائقہ نہیں کرتا۔ اس کی نظر انجام پر رہتی ہے - وہ مولوی کی طرح لفظ کا بندہ نہیں بلکہ معنی کو دیکھتا ہے - اصل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے اور باوجودیکہ وہ دنیا سے ایک گونہ بے تعلق اور مولوی اس کے مقابلے میں بہت زیادہ دنیا دار ہوتا ہے مگر وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے۔ وہ دلوں کو ٹٹولتا ہے اور اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ دلوں کی تہ تک پہنچتا ہے جہاں انسان کے اصل اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں، جن سے ہم خود بھی اکثر

واقف نہیں ہوتے - مولوی کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اس میں صوفی کی جیت ہے - اس کے بعد وہ نفس کی چوریاں اس آسانی، خوش اسلوبی اور لطف سے پکڑتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے کہ بعض اوقات مرید کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی - اس کا سب بڑا اور مقدم اصول دلوں کا ہاتھ میں لانا ہے اور اس مقصد کے حصول میں وہ کسی ظاہری رکاوٹ کی خواہ شرعی ہو یا غیر شرعی، پروا نہیں کرتا اور سب کو توڑ کے رکھ دیتا ہے - اور صحیح بھی ہے - جب دل ہاتھ میں آگیا تو گویا سب کچھ مل گیا - کسی دل کا ہاتھ میں لانا ایک نئی دنیا کے فتح کرنے سے کم نہیں ہے - یہ جو مشہور ہے کہ "دل بدست آور کہ حج اکبر است"، یہ صوفی ہی کا قول ہے اور صوفی ہی اس پر عمل کرسکتا ہے -

یہی وجہ ہے کہ علماء امراء بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے بھی وہ کام نہیں ہو سکتا جو فقیر اور درویش کر گزرتے ہیں - بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر کا دربار عام ہے جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب، عالم جاہل، کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا - بادشاہ جان و مال کا مالک ہے - لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے اور اس لئے ان کا اثر محدود ہوتا ہے اور ان کا بے پایاں اور یہی سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت و اقتدار حاصل ہو جاتا تھا کہ بڑے بڑے جبار اور با جبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے -

مسلمان درویش ہندوستان میں پر خطر اور دشوار گزار راستوں، سر بہ فلک پہاڑوں اور لق و دق بیابانوں کو

طے کر کے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمان کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبیعت کے مخالف تھی - جہاں کی آب و ہوا رسم و رواج، صورت و شکل، آداب و اطوار، لباس، بات چیت غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو اہل ملک سے اور اہل ملک کو ان سے وحشت ہو، لیکن حال یہ ہے کہ انہیں مرے صدہا سال گزر چکے ہیں لیکن اب بھی ہزاروں لاکھوں بندگان خدا صبح و شام ان کے آستانوں پر پیشانیاں رگڑتے ہیں اور جن جن مقامات پر ان کے قدم پڑے تھے وہ اب تک ”شریف“ اور ”مقدس“ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں - یہ کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کے کھینچنے کا وہ سامان تھا جو نہ امرا و سلاطین کے پاس ہے اور نہ علماء و حکماء کے پاس -

لیکن دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لئے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے - ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے - درویش کا تکیہ سب کے لئے کھلا تھا بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجب برکت سمجھتے - عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی - خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے - اس لئے تلقین کے لئے انہوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کئے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں -
(اردو کی ابتدائی نشوو نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵-۸)

---*---

مذہب و سائنس

۱

جن لوگوں نے فردوسی کی زندہ کتاب شاہنامہ کو پڑھا ہے۔ انہیں جنگ سہراب و رستم کی دلکش داستان یاد ہوگی ۔ شاعر نے اس رزم کو اس خوبی اور لطف اور فصاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور تخیل میں وہ شان پیدا کی ہے کہ بیان سے باہر ہے ۔ دونوں آمادۂ جنگ و پیکار ہیں لیکن ایک دوسرے سے بے خبر ہیں ۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تو یہ ہولناک سانحہ اور یہ پر الم ٹریجڈی واقع نہ ہوتی ۔

اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ لطف و فصاحت کے ساتھ امریکہ کے نامور فاضل ڈاکٹر ڈریپئیر نے مذہب وسائنس کی رزم دکھائی ہے ۔ مصنف کا زور قلم اور تبحر شاعر کے تخیل کے قریب پہنچ گیا ہے ۔ اس مضمون پر بحث کرنے میں فاضل مصنف نے دنیا کے تمام علوم اور مذاہب اور انسانی فطرت پر ایسی غائر اور وسیع نظر ڈالی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے ۔ (۱) کتاب ختم ہوجاتی ہے لیکن جنگ ختم نہیں ہوتی ۔ پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کیا

---

(۱) میں اس موقع پر اس کا اظہار واجب سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسا ہوا ہے کہ اردو زبان میں یادگار رہے گا ۔ حہاں

باقی صفحہ ۲۴۰ پر ملاحظہ فرمائیے

یہ جنگ یونہی ٹھنی رہے گی ؟ کیا انسان ہمیشہ اسی دھکڑ پکڑ اور دگدا میں رہے گا ؟ کیا وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا - اور نور ہدایت کبھی نہ پہنچے گا؟ رستم و سہراب کے حال سے تین شخص واقف تھے، ایک سہراب کا ماموں ژندہ رزم جسے اس کی ماں نے اسی غرض سے اس کے ساتھ کردیا تھا - دوسرا ہجیر - تیسرا کیکاؤس - لیکن افسوس کہ تینوں ہدایت سے باز رہے - پہلا درحقیقت نیک نیت ہے اور اسی کام کے لیے آیا ہے، لیکن قبل اس کے کہ کچھ کہے رستم کے ہاتھ سے مارا گیا - دوسرا طرح طرح کے توہمات میں مبتلا ہوگیا اور اس نے جان بوجھ کر اس راز کو چھپایا - تیسرے نے محض نفسانیت سے کام لیا - اسی طرح کی تین قوتیں مذہب و علم کی مصالحت میں بھی کھنڈت ڈالنے والی ہیں، یعنی جہالت، مخالفت حق اور نفسانیت - لیکن توہمات اور نفسانیت ایک دن مٹ کر رہے گی ، حق کا بول بالا ہوگا - دونوں مخالف ایک دوسرے کو جانیں اور پہچا نینگے -

---

بقیہ صفحہ ۲۲۹ کا

تک میرا علم ہے اردو زبان میں یہ پہلی علمی کتاب ہے جس میں اصل کتاب کے زور اور فصاحت کو بعینہ قائم رکھا گیا ہے- اس کتاب کے ترجمہ میں دو بڑی مشکلیں تھیں ایک تو علمی اصطلاحات و علمی مباحث - دوسری زبان کی خوبی و فصاحت - اردو سی کم بضاعت زبان میں ان دونوں کا قائم رکھنا بہت دشوار کام تھا- مگر مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو درحقیقت قابل مبارک باد ہیں اس مشکل کو نہایت خوبی سے آسان کردیا ہے- لیکن یہ اسی سے ہوسکتا ہے جس کے قلم میں اس قدر زور اور جسے زبان پر اس قدر قدرت ہو جیسے فاضل مترجم کو حاصل ہے-

ظلمت کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے گا۔ دوستی دشمنی، سے، رنج راحت سے، اور ٹریجڈی کامڈی سے مبدل ہو جائے گی۔ اور انسان کی کشمکش اور الجھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکر؟ اسے ہم آگے بیان کریں گے۔

۲

بچے کو دیکھو اس کی ساری حرکات حیوانی اور اضطراری ہیں۔ اس کا ھاتھ پاؤں مارنا، غوں غوں کرنا، ڈر سے سہم جانا، پیار کرنے سے ھمک کر آنا، ماں کی محبت، غیروں سے وحشت غرض یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حیوانی قوا کا غلبہ ھوتا ہے۔ اعلا اور دماغی قوا ادنا حالت میں ھوتے ھیں۔ جب بڑا ھوکر سیانا ھوجاتا ہے تو احساس اور خواھش کا زور شروع ھوتا ہے اور اعلا دماغی قویٰ کے نشو و نما سے نظام جسمانی کی قوت دھیمی پڑجاتی ہے۔ احساس کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ اور حسی غدود اعصابی کی ساخت اور توسیع میں ترقی ھونے لگتی ہے۔ یہ حالت جوانی دیوانی کی ہے۔ جب شباب کامل ھو جاتا ہے تو تمیز حیوانی احساس اور خواھشات عقل کی تابع ھوجاتی ھیں اور دماغی قوا اپنا رنگ دکھاتے ھیں۔

لہذا انسان کی نشو و نما کی تین صورتیں ھوئیں۔ حیوانی، احساسی اور عقلی۔

قوۃ حیوانیہ کے ذریعہ سے انسان اپنے جسم میں قوت جذب کرتا ہے۔ اور پھر اسے اپنے افعال، جذبات و خیالات

اور ارادے میں صرف کرتا ہے مثلاً جسمانی ورزش (یعنی اعصابی حرکت) سے بھوک لگتی ہے۔ سخت رنج و الم یا غصہ یا دیگر جذبات کیوجہ سے آدمی نڈھال ہوکر کام سے رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ حیات قائم رکھنے کے لئے ہمیں غذا کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے انجن کو ایندھن کی۔ یہی ایندھن یا غذا عضلات یا اعصابی ریشہ میں بدل جاتی ہے۔ جب ہماری قوت صرف ہوجاتی ہے تو ہمارا اندرونی انجن حساب پورا کرنے کے لئے ایندھن طلب کرتا ہے اگر غذا نہ پہنچے گی تو حساب میں فرق آجائے گا اور ضعف اس قدر بڑھ جائے گا کہ رشتۂ حیات ٹوٹ جائے گا۔

قوۃ حیوانیہ قوت جمع کر لینے کے بعد اسے حیوانی حسی یا عقلی حصے میں صرف کرسکتی ہے۔ تمام حیوانات سوائے انسان کے اس قوت کو اپنی نشو و نما اور اس کے انتقال سے اپنی نسل کے نمو میں صرف کرتے ہیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ غذا کی تلاش اور گھر کی ساخت اور زوج کی جستجو میں کام آتی ہے۔ انسان اس قوت کو جو وہ غذا سے حاصل کرتا ہے چاہے تو اپنے جسمانی حصے کی تکمیل میں صرف کرسکتا ہے اور چاہے تو دماغی تکمیل میں۔ ایک گنوار کو دیکھو اس کی زندگی بہت کچھ جانوروں سے ملتی جلتی ہے۔ وہ بہت بڑی مقدار قوت کی حاصل کرتا ہے اور اسے عضلات، گوشت اور خون کے بنانے میں صرف کردیتا ہے۔ اس کا صرف یہ مقصد ہے کہ اپنی زندگی کو قائم رکھے اور اپنی نسل کو بڑھائے۔ تعلیم

کا یہ اثر ہے کہ وہ اس قوت کو دماغ کی طرف رجوع کر دیتی ہے اور وہ خون کی لہر تمام سطح پر پہنچاتی ہے، جس سے خاکستری رنگ کے عروقی مادہ میں اکساد پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ تغیر خیال کے پیدا ہونے کی علامت ہے۔ دن میں جو کمی ہو جاتی ہے رات میں نیند اس کی تلافی کردیتی ہے اور دماغی ذرات میں اضافہ اور دماغی تلطیف (۱) گہری ہو جاتی ہے اور اکساد کے لئے زیادہ گنجائش نکل آتی ہے۔ جس طرح بہت سی چیزیں خون کو بناتی اور بڑھاتی ہیں اسی طرح وہ بعض چیزوں کو بطور فضلے کے خارج بھی کرتا رہتا ہے جو پیشاب، پسینہ وغیرہ کے ذریعہ سے نکل جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر قوت جذب کی جاتی ہے وہ سب کی سب پیشاب وغیرہ کی راہ سے خارج نہیں ہوجاتی، بلکہ دماغی ورزش سے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دماغ میں رہتے ہیں اور ان خیالات کو دماغ میں قائم رکھنے کے لئے بہت سا حصہ قوت کا صرف ہوتا ہے۔ یہ قوت اس طرح مستتر رہتی ہے۔ صرف غذا کے ذریعہ سے ہی قوت دماغ میں داخل نہیں ہوتی بلکہ ہر حس کے ذریعے سے کچھ نہ کچھ قوت پہنچتی رہتی ہے اور ہر عضلہ قوت کا توازن قائم رکھتا ہے۔ باصرہ، سامعہ، ذائقہ حرکت کی مختلف صورتیں ہیں۔ جس طرح برف آس پاس کی اشیا سے ایک مقدار حرارت کی جذب کرلیتی ہے، یہ حرارت قوت کی ایک صورت ہے اور جب برف پانی کی شکل میں مبدل

---

(۱) تلطیف - نرمی نمودن - مہربانی کردن۔

ہو جاتی ہے تو یہ قوت اس میں مستتر رہتی ہے ۔ پانی جب بخار کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ اور زیادہ قوت جذب کرتا ہے ۔ اس طرح انجماد، سیلان اور تبخیر قوت کی مختلف صورتیں ہیں ۔ اسی طرح روشنی ایک قسم کی قوت ہے جو روشن جسم کے اجزائے صغیر کی کپکپاتی ہوئی حرکت پر مشتمل ہے ۔ اس کی لہریں آنکھ کی پتلی میں پہنچتی ہیں ۔ اور پیچھے کی طرف ریٹنا (متشبکہ) پر جا کر لگتی ہیں ، اور اپنی حرکت دماغی اعصاب تک پہنچاتی ہیں جہاں وہ روشنی کے علم سے خیال کو پیدا کرتی ہیں ۔ آواز بھی ہوا کی حرکت ہے ۔ جب ہم اپنی انگلی سے ستار کے تار پر ضرب لگاتے ہیں تو ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے ۔ اور اسی کی لہریں کان تک پہنچتی ہیں جو وہاں سے ڈرم (جوف طبل) میں تموج پیدا کرتی ہوئی اعصاب باصرہ میں جا گونجتی ہیں اور وہاں وہ موسیقی کے خیال سے مبدل ہوجاتی ہیں ۔

غرض یہ کہ اعصابی فعل قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔

ہم اس صدمے کی قوت کو جو سرخی کی شعاعوں سے متشبکہ پر لگ کر دماغ پر پہنچتی ہے بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ سکتے کہ یہ قوت کہاں صرف ہوتی ہے ۔ لہذا وہاں پہنچ کر یہ مستتر رہتی ہے جس طرح کہ سورج کی قوت کوئلے کی تہوں میں مستتر ہوتی ہے اور اس وقت صرف ہوتی ہے، جب وہ جلتا ہے ۔ اسی طرح سرخ روشنی کی موجوں کے صدمے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے وہ دماغ میں

پہنچتی جاتی ہے اور وہاں جا کر خیال میں مبدل ہوجاتی ہے اور حالت منفعلہ میں رہتی ہے۔

جہاں ادراک نہیں ہوتا وہاں کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ مادر زاد اندھے کے دماغ میں سرخی کا کوئی خیال پیدا نہیں ہوسکتا، کیونکہ دیکھنے کے اعصاب میں وہ قوت نہیں پہنچتی جس سے سرخی کا خیال پیدا ہوتا ہے، نفی سے نفی پیدا ہوتی ہے اور عالم خیال اور عالم مادی دونوں میں یہ حالت یکساں ہے۔

پس جس چیز کو ہم نے دیکھا، سنا، سونگھا یا چکھا نہیں اس کی نسبت ہم خیال بھی قائم نہیں کر سکتے۔

عالم خیال یادداشتوں کے مجموعے یا اس کے صرف کا نام ہے۔ یہ یادداشتیں ادراکات کے آثار باقیہ ہیں۔ اگر خیال صرف نہ کیا جائے گا تو وہ باقی رہے گا۔ مثلاً فرض کرو حسن کا خیال ہے۔ جب ایک مصور کوئی تصویر بنا رہا ہے اور اس خیال کو کام میں لانا چاہتا ہے تو یہ مستتر قوت اس کے دماغ میں سے فوراً نکل آتی ہے۔

جانور کا فعل اضطراری ہوتا ہے۔ جسے تمیز حیوانی کہتے ہیں۔ وہ احساس ظاہری کے تابع ہوتی ہے تعقل سے اسے کوئی علاقہ نہیں۔ انسان میں احساس کا اثر اعصاب دماغی تک جاتا ہے جہاں خیال پیدا ہوتا ہے اور خیال شامل مسل رہتا ہے۔ ادراک عقل کا دروازہ ہے، احساس علم ہے بیرونی اشیاء کا جو جسمانی اثر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادراک میں یہ اعصابی

اثر ایک مرحلہ اور طے کرتا ہے اور بوجہ اس توافق کے جو دماغ اور بیرونی دنیا میں ہے یہ ذہنی صورت اختیار کرتا ہے اور عقلی یا دماغی مظہر بن جاتا ہے۔ بعض اوقات آوازیں ہمارے کان تک پہنچتی ہیں مگر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لئے کہ ہماری توجہ دوسری طرف ہے۔ یا بعض اوقات ہم آوازیں سنتے یا کتاب پڑھتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر تک سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن جونہی رکاوٹ رفع ہوجاتی ہے احساس دماغی اعصاب تک پہنچ جاتا ہے اکساد واقع ہوتا ہے اور ان الفاظ کے مطابق جو ہمارے کان تک پہنچے تھے خیال کی صورت قائم ہوجاتی ہے۔

وہ اعصاب دماغی جو احساس سے متاثر ہوتے ہیں مقام جذبات لطیف انسانی ہیں۔ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ خیال کو جذبات لطیف کی صورت مین تبدیل کر سکتا ہے مثلاً میں نے ایک شے دیکھی۔ اس کا ادراک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خوف کے جذبہ کو تحریک ہوئی، دل سکڑنا اور دم گھٹنا شروع ہوا۔

انسان میں دماغ بہت بڑی چیز ہے۔ یہ عقل کا دارالخلافہ ہے اور اسی کی وجہ سے انسان و حیوان اور شائستہ اور غیر شائستہ انسانوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ شائستہ اور مہذب اقوام کے لوگوں میں دماغ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت حبشیوں یا اور جنگلی لوگوں کے۔ بھیل یا گونڈ کی زندگی کا انحصار اس کے جسم کی چستی اور چالاکی پر ہے اس لئے اس کی قوت حیوانیہ بہ نسبت دماغ کے جسم

پر زیادہ تر صرف ہوتی ہے ۔ بخلاف اس کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے افراد کا انحصار زندگی عقل پر ہے اور اس لیے اس کی قوتہ حیوانیہ دماغ کو بڑھاتی اور جسم کو کمزور کرتی ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ عضلات کی ورزش سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے- اس کے یہ معنی ہیں کہ ہماری قوتہ حیوانیہ کی توجہ زیادہ عضلاتی ریشوں کے بنانے میں مصروف ہوجاتی ہے - ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تعلیم سے فہم تیز ہوجاتا ہے - یعنی قوتہ حیوانیہ دماغی مادہ کی ورزش میں لگ جاتی ہے- یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہین کہ جس قدر ہم اپنی قوت عضلاتی ورزش میں صرف کرتے ہیں اسی قدر عقلی فعل کمزور ہو جاتا ہے اور جس قدر دماغی کام پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر عضلاتی قوت ضعیف ہو جاتی ہے -

دماغ کی فضیلت کے تو سب قائل ہیں لیکن جذبات انسانی کچھ ایسے قابل وقعت نہیں سمجھے جاتے حالانکہ یہ بھی بڑی چیز ہیں ۔ لہذا اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں ۔ جذبات عقلی تحریک کے بہت بڑے محرک ہوتے ہیں اور ہمارے رنج و راحت کا حساب انہی کے ہاتھ میں ہے ۔ بعض چیزیں ہم ایسی دیکھتے ہین یا بعض آوازیں ہم ایسی سنتے ہیں جو ہمیں بھلی معلوم ہوتی ہیں، تو ہمارے جذبات ہماری عقل کو ابھارتے ہیں کہ ایسا ڈھنگ نکال لیں کہ ان خوشگوار اثرات کا پھر اعادہ ہوسکے- لیکن بخلاف اس کے جب ہم بعض چیزیں ایسی دیکھتے یا بعض

آوازیں ایسی سنتے ہیں کہ وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں تو ہمارے جذبات عقل کو ایسے ڈھنگ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کا نام نہ آنے پائے۔

مطالعہ میں اگر لطف نہ آئے تو انسان کی دماغی ترقی کا خاتمہ ہو جائے۔ بال بچوں، عزیزوں اور دوستوں سے محبت نہ ہو تو نہ کوئی خاندان ہو نہ لطف محبت ہو۔ شکل، رنگ اور آواز کے تناسب سے اگر خوشی نہ ہو تو فنون لطیفہ بھی نہ ہوں۔ یہ سب جذبات کا کھیل ہے۔ جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشو و نما انسان کی بہبودی اور ترقی کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقلی کی نشو و نما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے۔ مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف ہے۔ مگر عقل کہتی ہے کہ نہیں یہ ٹھیک نہیں اور یہی بنائے مخاصمت ہوتی ہے۔

جذبات کا اثر جسم پر بہت بڑا ہوتا ہے۔ زیادہ غصہ کرنے سے دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مارے شرم کے تمام سطح جسم پر خون دوڑ جاتا ہے۔ شدید جذبات کے اثر سے دماغی ریشوں میں بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے، اور دماغی امراض سے عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ ایک حقیقی بد باطن کے چہرے کو دیکھیے، کیسی پھٹکار برستی ہے

بخلاف اس کے ایک نیک نفس زندہ دل کے چہرے کو ملاحظہ کیجئے جیسے پھول کھلا ہو۔

اسی طرح جسمانی حالت کا اثر جذبات اور جذبات کے ذریعہ سے دماغ پر پڑتا ہے۔ بیمار آدمی چڑچڑے اور غصہ ور ہو جاتے ہیں۔ قوی آدمی کے جذبات بھی قوی ہوتے ہیں اور ضعیف کے ضعیف۔ جب طبیعت نڈھال ہوتی ہے تو خواہشیں بھی کمزور ہوجاتی ہیں۔

غرض جذبات اور عقل دماغ کی دو حالتیں ہیں ایک زنانہ ہے اور دوسری مردانہ۔ اگر صرف عقل ہی کی نشو و نما اور ترقی زیادہ ہو گی تو جذبات محدود اور کمزور ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر عقل کی طرف سے غفلت کی گئی اور جذبات کی پرورش زیادہ ہوئی تو انسان ذکی الحس ..... اور کم عقل ہو جاتا ہے۔

جذبات کا کام عقل کو تحریک دینا اور عقل کا کام جذبات کو اعتدال پر لانا ہے۔ وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہیں نہ کہ زائل کرنے کے لیے۔

عقل انسان میں تشخص اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور جذبات مدنیت اور آنس۔ بحیثیت عقل کے وہ ایک اور اکیلا ہے اور بحیثیت جذبات کے وہ منجملہ اوروں کے ایک ہے۔ پرزور عقل و دماغ کا آدمی اپنے ابنائے جنس سے بھاگتا

اور صحبت سے نفرت کرتا ہے اور تنہائی میں خوش رہتا ہے۔ لیکن پرزور جذبات والے آدمی کے لیے تنہائی موت ہے۔ وہ دوسروں میں ایسا گھل مل جاتا ہے کہ اس میں سے رفتہ رفتہ رنگ تشخص غائب ہو جاتا ہے اور خیالات کو باقاعدہ ترتیب دینے کی قوت نہیں رہتی - پرزور عقل و دماغ کا آدمی خود مختار اور آزاد سا ہو جاتا ہے اور سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ جہاں عقل ہی عقل ہوتی ہے اور جذبات نہیں ہوتے وہاں صرف اپنی حفاظت اور اپنا ہی خیال ہوتا ہے جو خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے۔ جذبات ہمیں صرف اپنی ایک ذات تک نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کی طرف بھی مائل کرتے ہیں۔ دوسرے انسانوں اور اشیائے قدرت سے محبت ہوتی ہے اوروں کے درد کو ہم اپنا درد سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے دماغی قوا اور علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔

عقل اور جذبات میں اتحاد پیدا کرنا، ظاہر اور باطن میں موافقت قائم رکھنا، ایک دوسرے کو حد اعتدال سے نہ بڑھنے دینا، جسم کے افعال کو عقل و جذبات کے زیر حکومت رکھنا، مذہب کا کام ہے۔

فلسفہ و منطق اور علوم نظری عقل کو بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ تمدن، پالیٹکس اور اتحاد مقاصد انسانی و قومی جذبات کو فروغ دیتے ہیں لیکن مذہب کا حق یہ ہے کہ وہ عقل و جذبات کو ساتھ ساتھ اور برابر بڑھائے، باہم اعتدال قائم رکھے، اور قوت حیوانی کو دماغی اور احساسی

حصۂ جسم کی پرورش اور نشو و نما میں یکساں صرف کرے۔

۳

حیات کے دو مقصد ھیں۔ ایک ذاتی ترقی دوسرا افزائش نسل۔ قوت کے انجذاب کے لئے ضرور ھے کہ اس کا اندفاع بھی کیا جائے اور اس غرض سے کہ وہ مادہ اور قوت کا انجذاب اور اندفاع کر سکے۔ حیات کے لئے ضرور ھے کہ اس میں معرفت طبعی ھو جہاں ساخت اعضا ادنا درجہ کی ھے وھاں یہ کم ھوتی ھے اور جہاں ساخت پیچیدہ ھوتی ھے وھاں زیادہ ھوتی ھے۔

بقول لب نٹز کے حیات حجریات مین سوتی ھے، پھولوں میں خواب دیکھتی ھے اور انسان میں جاگتی ھے۔

اس معرفت طبعی میں ارادہ ھونا چاھئیے زندہ رھنے، بڑھنے اور نسل کے بڑھانے کا۔ نیز طبعی تمیز ھونی چاھئیے۔ بغیر اس تمیز کے ترقی حیات کے لیے مناسب اور غیر مناسب اشیا کا انتخاب کرنا ناممکن ھے اور بغیر اس ارادہ کے کہ زندہ رھنا چاھئیے اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ھو سکتا۔

تمیز طبعی افزائش اور نشو و نما کا پیمانہ ھے۔ اس کا تعلق ھر وجود کی ضروریات سے اس طور پر ھے کہ حیات کے اُن دو مقاصد کے لئے کافی ھو، کیوں کہ اگر یہ تعلق اس طرح قائم نہ ھو تو ممکن ھے کہ اس کی قوت ایسی

شے کے حاصل کرنے میں صرف ہو جائے جو حاصل نہیں ہو سکتی اور قوت کی تولید ضائع اور بیکار ہو جائے۔ پودے کو نشو و نما کے لئے روشنی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ پودا کسی اندھیرے اور گرم حجرے میں لگا دیا جائے تو جو قوت اس نے زمین سے حاصل کی ہے وہ اس شے کے حصول کی کوشش میں صرف ہو جائے گی جو وہاں نہیں مل سکتی۔ جب یہ قوت اس کوشش میں صرف ہوجائے گی تو وہ مرجھانا شروع ہوگا اور مر جائے گا۔

پودے کی نشو و نما کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پانچ چھ ہیں۔ وہ اسے کچھ تو اس زمین سے حاصل ہو جاتی ہیں جس میں وہ لگا ہوا ہے اور کچھ ہوا اور روشنی سے۔

حیوانی زندگی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ایک جگہ نہیں بلکہ دور دور پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے جمع کرنے کے لئے اسے حرکت کی ضرورت ہے، لہذا وہ اسے دی گئی ہے۔

حیوانات کو ایک اور محرک شے عطا ہوتی ہے جو پودوں میں نہیں، یعنی خوشی کا احساس۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایسا فعل کرتا ہے جو اس کی کامل نشو و نما کا باعث ہوتا ہے، اور ایک احساس تکلیف کا ہے جو اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس سے ایسا فعل صادر ہو جو اس کی ترقی کو روکے۔ اگر اسے تکلیف محسوس نہ ہو تو وہ کھانے

کی بھی کوشش نہ کریگا اور اس طرح اس کی حیات کا کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حواس ارادہ کو اکساتے اور تمیز طبعی کو سبق دیتے ہیں ۔ لیکن نہ وہ ایک دوسرے سے مقدم ہیں اور نہ ایک دوسرے کا پیدا کرنیوالا ہے ۔ چھوٹا پرندہ انڈے کے اندر نہ صرف خیال کرتا ہے بلکہ اس سے فعل بھی صادر ہوتا ہے کیوں کہ وہ نکلنے کے لئے خول توڑتا ہے اور باہر نکلتے ہی دانہ چننے کے لئے چونچ کھولتا ہے ۔ قید کی حس نے اس کے ارادے کو اُبھارا جس سے اس کے عضلات حرکت میں آئے اور خول ٹوٹ گیا ۔ لیکن یہ تمیز طبعی کا کام تھا، تجربہ سے کچھ علاقہ نہیں ،کیوں کہ اس سے پیشتر وہ کون سے محبس توڑ کر باہر نکلا تھا۔ اسی تمیز نے اسکی چونچ کھلوائی ۔ یہ ننھا سا جانور زندہ ہے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے ۔ اسے زندگی دی گئی ہے اور زندگی کے ساتھ زندگی کی محبت بھی عطا ہوئی ہے ۔ چھوٹا بچہ دنیا میں ارادے، تمیز طبعی اور احساسات کے ساتھ آتا ہے۔ زندہ رہنا اس کے لیے لطف ہے۔ خواہش اس کا پہلا احساس ہے ۔ اس خواہش کا پورا ہونا اس کی پہلی خوشی ہے ۔ خواہش کا پورا نہ ہونا اس کی پہلی تکلیف ہے اور اس کی طلب اس کی پہلی کوشش ہے ۔ کس تجربہ نے اسے یہ بتایا ہے کہ منہ اور گلے کے ذریعے سے دودھ کا پینا اسکی زندگی کے لئے ضروری ہے؟ یہ تمیز طبعی ہے جس نے اسے اس فعل پر آمادہ کیا جس سے اس کی بھوک کا احساس رفع ہوا ۔

حیوانات کو خوشی اور تکلیف کے ایسے احساسات ہوتے ہیں جو اس کے حیوانی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں - ہر چیز جو حیوان کے ارد گرد پائی جاتی ہے جہاں تک کہ اس کی ذاتی نشو و نما یا اس کی نسل کی افزائش کا تعلق ہے یا تو اسے خوشی دیتی ہے یا تکلیف -

نظام اعصابی ایک بڑا قوی آلہ قوت پہنچانے کا ہے - تمام جسم پر حسی اعصاب پھیلے ہوئے ہیں - اور یہ سب اعصابی مرکز سے پھوٹتے ہیں جس میں باریک اعصابی ریشے ہوتے ہیں اور آپس میں خوب ملے ہوتے ہیں ، سب سے بیرونی عصبہ جو اثر حاصل کرتا ہے وہ اسے دماغ تک پہنچاتے ہیں - اور وہاں یہ اثرات یا خیالات جمع رہتے ہیں اور ان خیالات پر سے افعال سرزد ہوتے ہیں- دوسرے حیوانات خیالات پر سے کام نہیں کرتے ہیں ، سوائے اس حالت کے جب وہ ان دو مقاصد کے لئے مفید ہوں - یعنی ذاتی فلاح اور افزائش نسل -

انسان اور بھی کئی باتوں میں دوسرے حیوانات سے مختلف ہے - دوسرے حیوانات کو جو گرمی سردی محسوس کر سکتے ہیں فطرت نے لباس اور پناہ دے رکھی ہے - مثلاً ان کے بال یا پر یا خول ہوتے ہیں یا زمین کے اندر کھوؤں اور غاروں میں رہتے ہیں ، جہاں گرمی سردی کا گزر نہیں- لیکن جسم انسان کی اعصابی سطح بہ نسبت دوسرے حیوانات کے احساس کرنے میں بہت تیز ہے، تاہم وہ دنیا میں بے بال و پر کے ننگا منگا آتا ہے لہذا اسے مصنوعی لباس کی ضرورت

ہوئی لیکن لباس کے تیار کرنے کے لیے اُسے ایسی قوت عطا کی گئی جو دیگر حیوانات کی تمیز طبعی سے اعلا ہے۔

اسی طرح عقل انسان کی حیوانی فطرت کے لیے ضروری ہے۔ ہر حیوان کو ایسی قوت عطا ہوئی ہے جو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور یہ قوت اس ضرورت کی مناسبت سے ہوتی ہے۔

بھیڑ مادہ اور قوت کو غذا کے ذریعہ سے اپنے میں جذب کرتی ہے اور وہ قوت اون کی شکل میں مادہ کو پیدا کرتی ہے۔ انسان میں بھی مادہ اور قوت ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے اور دماغ پیدا کرتا ہے جو اسے مصنوعی طور سے سردی سے بچانے میں مدد دیتا ہے۔

اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان کی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اس حصہ کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں، ہمیں رنگوں کے تناسب، حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے۔ حیوانی زندگی کو ان کی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس

کے علاوہ اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہئے ، کیوں کہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطری تمیزوں ، احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار جاتا ہے ۔ انسان ایسی اشیا سے بیحد مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے جنہیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں ۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا ۔ حالاں کہ انسان اس سے لطف اٹھاتا ہے ، کیوں ؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اس کی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے جو اس کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے یہاں تک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں ۔ لوری یا گانا سننے سے انہیں بھی مزہ ملتا ہے ۔ خوبصورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں ۔

انسان کی ساخت میں حصۂ اسفل میں حیوانی آلات ہیں اور حصہ اعلا میں روحانی آلات ہیں ۔ حصۂ اسفل کو ہاضمہ اور توالد سے تعلق ہے اور حصۂ اعلا قوت حاصل کرنے کا آلہ ہے جسے حصۂ اسفل توالد و تناسل میں صرف کردیتا ہے ۔ حصۂ اعلا میں دماغ یعنی مقام عقل ہے ۔ قوت حیوانی ارادے کے زور سے ہر طرف پہنچ سکتی ہے ۔ جذبات گویا اس طرح واقع ہیں کہ ذرا سی ٹھیس سے فطرت حیوانی یا فطرت روحانی کی طرف مائل ہوسکتے ہیں ۔

وحشی اقوام میں قوت حیات شہوانی زندگی میں صرف ہوتی ہے اور دماغ بیکار ہوتا ہے، لیکن تعلیم یافتہ اقوام میں

قوت حیات زیادہ تر دماغ کی طرف مائل ہوتی ہے اور شہوانی زندگی کمزور ہوجاتی ہے کیوں کہ سخت دماغی محنت سے اعصابی ریشے زیادہ بیکار ہوتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے دوسرا اعصابی مادہ صرف ہوتا ہے، اور وہ ذرات جو توالد و تناسل کے لئے ضروری ہیں بننے بند ہوجاتے ہیں۔ لہذا جس قدر دماغی محنت کی جائے گی اسی مناسبت سے وہ توالد اور تناسل کے مزاحم ہو گی، کیوں کہ دماغی محنت میں وہ تمام قوت صرف ہوجاتی ہے جو بصورت دیگر ان ذرات کے بنانے میں صرف ہوتی جو توالد و تناسل کا باعث ہوتے ہیں۔

جب توجہ فطرت حیوانی کی طرف ہوتی ہے اور جذبات و عقل کو اس کے تابع کردیا جاتا ہے تو دماغ صرف اسی قدر کام دیتا ہے جیسے دوسرے حیوانات میں تمیز طبعی۔ اس وقت وہ مسرت جو حصول علم، ورزش عقل، احساس حسن وغیرہ سے ہوسکتی ہے زائل ہوجاتی ہے۔ بخلاف اس کے جب عقل پر بیحد زور دیا جاتا ہے تو رنج و راحت کا وہ احساس جو ان چیزوں سے حاصل ہوتا ہے جو حیوانی فطرت سے بہت پرے ہیں، تیز ہوجاتا ہے اور فطرت حیوانی کمزور ہوجاتی ہے۔

رنج و راحت کا ادراک کیا ہے؟ یہ درحقیقت قوت کی تحلیل کا نام ہے۔ چنانچہ دوسرے حیوانات کی زندگی کو دیکھو کہ انسان کو جن چیزوں سے لطف آتا یا صدمہ ہوتا ہے انہیں نہیں ہوتا۔ ایک گنوار کو عمدہ تصویر یا خوشخط کتاب دکھاؤ اسے کچھ لطف نہ آئیگا،

کیوں کہ اس کے دماغ میں کوئی شے اسے گرفت یا تحلیل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کی حالت صاف شیشے کی چادر کی سی ہے جس میں شعاعیں آئیں اور نکل گئیں۔

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مادی قوت ہے ایک روحانی قوت بھی ہے اور روحانی توالد و تناسل کا سلسلہ عالم خیال میں جاری ہے، مگر اس طرح نہیں جیسے ہم عالم مادی میں پاتے ہیں۔

پانسو برس ہوئے ایک بڑے دانشمند نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کے خیالات ننھے ننھے بیج تھے جو ڈال دئے گئے میں نے اس کتاب کو کھولا اور پڑھا۔ ان بیجوں نے میرے دماغ میں جڑ پکڑی۔ بڑے ہوئے اور پھلے پھولے۔ میں نے ان خیالات کو بات چیت یا تحریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچایا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہی خیالات، وہی باتیں، وہی تخیل نسلاً بعد نسل پیدا ہوا اور بڑھا اور زمانہ کی مناسبت سے ان میں تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا۔ گویا یہ سب ان اصلی خیالات کی زندہ اولاد ہیں، جو اس وقت وجود میں آئے تھے جب تاریخ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

قطع نظر اس قیاس کے ہم مادی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ قوت میں کیسی کیسی بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قوت ہی کے تغیر و تبدل سے روشنی، حرارت اور برق جیسی مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح

دماغ میں بھی تغیر و تبدل سے قوت افعال، ارادہ ، ادراک اور خیالات و جذبات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حیوانی زندگی میں رنج و راحت سے قوت کی تحلیل کا پتہ لگتا ہے اور ہم اس قوت کا اندازہ جو بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہے اس قوت سے کرسکتے ہیں جو جذب یا داخل ہوئی تھی۔ روحانی زندگی میں بھی رنج و راحت قوت کی تحلیل کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو قوت کہ جذب ہوتی ہے وہ خیالات کے سلسلہ سے نشو و نما پاتی ہے۔

مقصد حیات جس کے کارکن رنج و راحت ہیں حیوان کی نشو و نما اور اس کی نسل کی افزائش ہے۔

روحانی احساس کا مقصد روحانی زندگی کی نشو و نما ہے۔ جسم میں قوت کا انجذاب ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندفاع ہوتا ہے۔ اب جو باقی رہی اس سے نشو ونما ہوتی ہے۔ حیات کے ذریعہ سے روحانی زندگی بڑھ سکتی ہے اور نشو و نما پاسکتی ہے۔ ہر درخت اور حیوان کی نشو و نما کی ایک حد ہے، تو روحانی زندگی کی حد کیا ہے؟

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں ایسی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے جنہیں مادی فلاح سے کچھ تعلق نہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہم میں کوئی ایسی قوت ہے جو ہمیں کسی خاص سمت میں لیے جارہی ہے۔ تو وہ سمت کیا ہے؟

دنیا نے اس کے دو جواب دئے ہیں ۔ ایک یہ کہ انسان کی غایت تمدنی اور سیاسی ترقی ہے اور اسی پر اسے ساری ہمت اور قوت صرف کردینی چاہئے ۔ اس خیال کی بنا پر بنی نوع انسان کل ایک ہیں جن کا مقصد موجودہ کی تکمیل اور آیندہ کا کمال ہے۔ گزشتہ تجربے اور علم سے فائدہ اٹھا کر موجودہ زمانہ زیادہ ترقی یافتہ ہے اور آیندہ ترقی پر ہونا چاہئے ۔ اور نیکی اور برائی اسی میں ہے جس سے عام بنی نوع انسان کی بہبودی یا مضرت متصور ہو ۔

لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عقلی ترقی جسمانی انحطاط کا باعث ہوتی ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی جاتی ہے اس میں ایسی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں جو وحشی اقوام میں نہیں پائی جاتیں ۔ ایک وحشی قوم کے بد قوارہ ضعیف اور مریض افراد بچپن ہی میں مرجاتے ہیں ۔ مہذب ممالک میں امراض اور جسمانی نقائص بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں کیوں کہ سائنس ان خرابیوں کی حفاظت کرتا، انہیں پھیلاتا اور آیندہ نسلوں تک پہنچاتا ہے ۔ وحشی اقوام میں از روئے انتخاب فطری ضعیف اور مریض خود بخود مرجاتے ہیں۔ مہذب اقوام میں اس قانون پر عمل نہیں ہونے پاتا اور اس لیے قوم میں انحطاط پیدا ہوجاتا ہے۔

سب سے ادنا جانداروں میں سب سے زیادہ افزائش نسل ہوتی ہے۔ بعض چھوٹے جان دار ایسے پائے گئے ہیں کہ چند گھنٹوں میں اس قدر بچے پیدا کردیتے ہیں کہ شمار سے

باہر ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں بلوغ تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اور بچے بھی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن جانوروں میں عقل کا درجہ بڑا ہے ان میں اولاد بھی کم ہوتی ہے۔ انسان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے۔ غریب لوگ جنھیں جسمانی ورزش زیادہ کرنی پڑتی ہے اور عقل سے کام کم لینا پڑتا ہے، ان کے کثرت سے بال بچے ہوتے ہیں۔ اعلا تعلیم یافتہ لوگ جنھیں دماغی محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے ان کے اولاد کم ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے تمدنی ترقی تقسیم کار میں ہے، غیر متمدن حالت میں جو کام ایک شخص کرتا تھا وہ اب بیس شخص کرتے ہیں پہلے ایک ہی شخص لوہار، بڑھئی، درزی، موچی، معمار ہوتا تھا۔ تھوڑی ترقی کے بعد لوہار کا کام ایک کرنے لگا، بڑھئی کا دوسرا، درزی کا تیسرا، موچی کا چوتھا، معمار کا پانچواں، اسی طرح ایک ایک پیشہ ایک ایک شخص کو مل گیا۔ اب جو اور ترقی ہوئی تو ایک ہی پیشہ کی کئی شاخیں ہوگئیں اور ہر شاخ کا کام علاحدہ علاحدہ شخص کرنے لگے اور روز بروز کام کی تقسیم کو ترقی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک شخص بولتا جاتا ہے، دوسرا لکھتا ہے، تیسرا صاف کرتا ہے، چوتھا اسے صحیح کرتا ہے، حالانکہ یہ ایک ہی شخص کا کام ہے۔ کیا درحقیقت یہ تقسیم کار ترقی کی علامت ہے؟

انسان یہاں کچھ ایسے بکھیڑوں اور مصیبتوں میں

پھنسا ہوا ہے کہ اس کی خوشی کا دار و مدار زیادہ تر اس کی ذات پر ہے۔ اُسے یہ خیال ہرگز تسلی نہیں دے سکتا کہ آیندہ دوہزار یا تین ہزار سال کے بعد انسان کی یہ تکلیفیں رفع ہو جائیں گی ۔ اس خیال سے اُس کی تکلیف یا درد میں تخفیف نہیں ہوسکتی ۔ دوسرے ایک ایسی قوم میں جو اعلا درجہ کی مہذب نہیں خوشی کی مقدار بہت زیادہ ہے بہ نسبت ایک ایسی قوم کے جو بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہے۔ ایک گنوار یا کھیت کے مزدور کو دیکھو کیسا خوش اور مگن ہے۔ بر خلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں جاؤ ۔ مثلاً لندن، پیرس، شکاگو، نیویارک میں جو چشم و چراغ عالم کہلاتے ہیں وہاں اُمرائ خوشی کی جستجو مین مارے مارے پھرتے ہیں، طرح طرح کی کوشش کرتے ہیں، دولت صرف کرتے ہیں، لیکن پھر بھی خوش نہیں رہ سکتے اور غریب ہیں کہ قعر مذلت و افلاس میں پڑے ہیں۔ لہذا محض تمدنی و پولیٹکل ترقی اور محض یہ خیال کہ آیندہ کسی بعید زمانے میں یہ تکلیف اور رکاوٹیں رفع ہوجائیں گی انسان کے دل کو تسلی نہیں دے سکتا ۔

اب دوسرا جواب مذہبی عقیدہ میں ہے ۔ مذہبی خیال میں حیوانی فطرت کو دخل نہیں ۔ ذاتی یا انفرادی مقصد انسان کو زیادہ تحریک دیتا اور ابھارتا ہے، بہ نسبت ایک ایسے مقصد کے جس کا تعلق عام بہبودی سے ہو، اور انسان میں ایک ایسی خواہش موجود ہے جس میں کچھ

شبہ ہو نہیں سکتا ۔ عام بہبودی یا ایثار کا خیال ذاتی بہبودی کے خیال کو روک دے گا اور تمدنی اور سیاسی ترقی کی طرف لے جائے گا ۔ انفرادی بہبودی کا خیال انفرادی ترقی کا باعث ہوگا ۔ آن قوا اور امتیازات کا وجود جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممیز کرتے ہیں قطعی ہے ۔ دوسرے حیوانات اس وقت تک نہ کوئی خیال سوچتے ہیں اور نہ کسی خیال کو اپنی خواہش کا مصداق قرار دیتے ہیں جب تک کہ وہ ان کی ذاتی نشو و نما یا ترقی کا باعث نہ ہو ۔ گھوڑا کبھی گوشت کھانے کا خیال نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کی نشو و نما کے لئے ضروری نہیں ہے ۔ پس وہ چیزیں جن کے لئے انسان کی حیوانی فطرت خواہش مند ہے ضرور حقیقی وجود رکھتی ہیں ۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کی طرف انسان کی دماغی اور جذباتی فطرت دوڑتی ہے ان کا بھی ضرور کوئی وجود ہے ۔ تمیز طبعی ایک قسم کی خواہش ہے جو ہمارے وجود کے قانون کا اتباع کرتی ہے اور ہر قانون کا مقصد مخلوق کی خوشی اور تکمیل ہے ۔

انسان کی مذہبی تمیز کا سراغ لگانا اس کی بہبودی کے قانون کا سراغ لگانا ہے ۔ جب مذہبی تمیز ہم میں نمودار ہوتی ہے تو وہ ہماری روحانی فطرت کی آواز ہے جو اس غذا کو طلب کرتی ہے جو اس کی حیات و تکمیل کے لئے ضروری ہے ۔ جب کبھی مذہبی تمیز ہمیں غلطی کی طرف لے جاتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مذہبی تمیز غلط ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے اسی قسم

کی دوسری تمیزوں کو دبا دیا ہے، مثلاً ہر طریقۂ گورنمنٹ صحیح اصول پر قائم ہوتا ہے لیکن جب وہ دوسرے صحیح اصولوں کو پائمال کردیتا ہے تو اس طریقۂ گورنمنٹ میں زوال شروع ہوجاتا ہے۔ اسی طرح مذہب میں غلطی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب وہ مجموعۂ توہمات ہو جاتا ہے تو اس کے نظام میں خرابی واقع ہوجاتی ہے۔ کسی ایک صداقت میں مبالغہ کیا جا تا ہے اور اسے آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے اور دوسری صداقتوں سے بالکل روگردانی اختیار کرلی جاتی ہے۔ اس وقت مذہب کو زوال شروع ہو تا ہے۔

۴

انسان میں دوطبعی تمیزیں ایسی ہیں جن کا اثر انسان کی تمدنی زندگی پر بہت بڑا ہوتا ہے۔

ان میں سے ایک تو ہر واقعہ کے سبب دریافت کرنے کی دھن ہے، دوسرے منتہائے کمال کا تصور۔ اب ہم ان دونوں پر الگ الگ غور کریں گے۔

انسان کے دماغ پر دو قسم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ایک بیرونی اشیاء کا اثر حواس کے ذریعہ سے، یعنی حس ایک ذریعہ ہے جس سے بیرونی اشیاء اور دماغ میں تعلق قائم ہوتا ہے، اگر کسی میں کوئی حس نہیں تو اس حس کی وجہ سے جو خیال قائم ہوتا ہے وہ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ایک مادر زاد اندھے کو سرخی کا کوئی خیال نہیں ہوسکتا۔

دوسرے اندرونی اثرات جو دماغ خود اپنے تعلق سے جس سے انسان کی شخصیت قائم ہے، حاصل کرتا ہے۔ یہ مسرت، غصہ اور خواہش کے ادراک ہیں۔

یہ ادراکات مفرد اور غیر منقسم ہیں اور تعریف کی حدود میں نہیں آسکتے۔ گویا معرفت طبعی کے انتہائی سالمات ہیں جن کے ملنے اور ترکیب پانے سے بے شمار مختلف صورتیں قائم ہوتی رہتی ہیں۔ انہی ادراکات پر بعض ایسے ابتدائی عقائد کی بنیاد ہے جو بہت عام ہیں اور انسان بہت ابتدا میں انہیں حاصل کرتا ہے۔

علت و معلول کا عقیدہ بھی اسی قسم کا ہے۔ تمیز طبعی انسان کو علت و معلول کی تلاش پر ابھارتی ہے کیوں کہ اس کی صداقت کا اسے پورا یقین ہے۔ بغیر اس کے دنیا کی ترقی نا ممکن ہے۔ اور دنیا محض اتفاقی نتائج کا مجموعہ نظر آئے گی اور حکمت و سائنس اور علم اخلاق کا مطالعہ بیکار ہوگا۔

علت کے معنی کیا ہیں؟ جس کی وجہ سے کوئی شے وجود میں آتی ہے علت ادنا کہلاتی ہے اور بعد ازاں جو اس میں تغیر و تبدل کرتی ہے اسے علت ثانیہ کہتے ہیں۔ اگر کوئی جسم جو حرکت میں ہے کسی دوسرے جسم سے جو ساکن ہے ٹکرائے اور اسے حرکت دے تو اس کی علت ثانیہ پہلے جسم کی قوت متحرکہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی خیال اس طرف بھی جاتا ہے کہ پہلے جسم کی حرکت کی بھی کوئی

علت ہے۔ علل ثانیہ ایک سلسلہ علل کا ہے جو علت اولا پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور انسان فطرتاً علل ثانیہ کے سلسلہ میں اس مصدر حرکت کو ٹٹولتا ہے جو خود بخود پیدا ہوئی اور جسے وہ علت اولا کہتا ہے۔

علت کا خیال مفرد نہیں ہے بلکہ اس میں ایک تو خیال وجود کا ہے اور دوسرے اس تعلق کا جو عدم سے وجود میں آتا ہے۔ صرف وجود کا ہونا علت کے خیال کے لئے کافی نہیں۔ کیوں کہ اس کے متعلق یہ تصور کرنا ممکن ہے کہ وہ سلسلہ علت و معلول سے بالکل الگ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شے ہے تو اگرچہ ہم صحیح طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس بیان سے کیا مطلب ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہم اسے پورے طور سے سمجھ لیتے ہیں۔ اب اگر ہم ان تمام اشیاء کو جو نہیں ہیں الگ کردیں ، نیز ہم یہ فرض کرلیں کہ کوئی اور ایسی شے نہیں ہے جو ان کے پیدا کرنے والی ہو یا ان کے پیدا کرنے میں اس نے حصہ لیا ہو تو عدم سے وجود میں آنے کی حالت ہمارے لیے بالکل ناقابل تصور ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عدم سے وجود میں آنے کی حالت کا خیال بالکل ناممکن ہے۔

جو عدم کی حالت سے وجود میں آتا ہے تو اسے اس حالت کے پیدا کرنے کے لئے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو اس سے بالکل الگ ہو ۔ یہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے، جو کسی طرح مٹ نہیں سکتا ۔ یہاں تک کہ جو فلسفی سلسلۂ علت و معلول سے انکار کرتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی

میں ہر وقت اور ہر آن اسی پر عمل کرتے ہیں ۔

کیا یہ عقیدہ قابل اعتماد ہے یا محض دھوکا ہے ؟

اگر یہ دھوکا ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان علت کا خیال اس واقعہ سے متعلق کرتا ہے جو دوسرے واقعہ سے وقت میں مطابق یا اس سے قبل ہے ۔ چاند کی تبدیلی اور موج کی مد ایک ہی وقت میں پائی گئی ۔ انسان نے چاند کی تبدیلی کو موج کی مد کا باعث قرار دیا ، لیکن یہ کیوں نہیں خیال کیا کہ چاند کی کمی و بیشی موج کی مد و جزر کی تابع ہے ۔

ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا ہونا ہمیشہ یکساں پایا گیا ہے ۔ اس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں پایا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یکسانی ہمیشہ قائم رہے گی ۔ اور تاہم علت کا خیال ان میں سے کسی پر عائد نہیں کیا گیا ۔ دن رات کے بعد آتا ہے مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ رات دن کی علت یا سبب ہے ۔

علت و معلول کا نتیجہ تجربہ سے اور پختہ ہوجاتا ہے تجربہ یقین کا معلم ہے، جس طرح احساس تمیز طبعی حیوانی کا ۔ اگر تجربہ نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ سمجھتے کہ کسی علت کا ہونا ممکن ہے ۔ کیوں کہ وجود کے خیال میں یہ ضرور نہیں ہے کہ قوت کا خیال بھی ہو ۔ قوت کا تصور ہوسکتا ہے لیکن یہ ہم نہیں جان سکتے کہ کوئی چیز حقیقت میں ویسی ہے ۔ اس طرح قوت کا خیال تو ہم میں

ہے مگر مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

علت و معلول کا عقیدہ نہ صرف ہماری نشو و نما بلکہ ہماری اعلا ہستی کی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے۔ حیوان کو علت کا کوئی خیال نہیں وہ صرف علل ثانیہ کو دیکھتا ہے۔ کوا تجربہ سے بندوق دیکھ کر ڈرنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی نالی میں سے گولی نکلی تو مجھے چوٹ لگے گی یا مر جاؤں گا لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور اس لئے حیوان کبھی بارود کی ترکیب نہ معلوم کرسکے گا۔ اگر یہ دھوکا ہوتا تو تعجب ہے کہ کیوں لاکھوں آدمیوں کے تجربے نے آسے غلط ثابت نہ کردیا ؟ اور پھر کیوں انسان اس کی وجہ سے وحشت و جہالت سے نکل کر تہذیب و شائستگی تک پہنچ گیا۔ جس شوق و ذوق سے انسان اسباب کے دریافت کی تحقیق کرے گا اسی قدر اسے ترقی ہو گی۔ حیوان جو علل ثانیہ تک پہنچ کر رہ جاتا ہے، آسی حالت میں ہے۔

ادنا سے اعلا دماغ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس میں قوت ہے اور آس قوت کا مقام ارادہ ہے اور یہیں سے انسان کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں۔ گو انسان ارادے کی تمام حرکات پر غور نہ کرے لیکن وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ہر قدم اسی پر منحصر ہے۔ جہاں ارادہ رکا ہم چلنے سے رک جاتے ہیں۔ انسان کا خیال ہے کہ وہ اپنے ارادے میں مختار ہے اور اس کے تمام افعال اس مختار قوت پر مبنی ہیں۔ اس کا یہ خیال کہ اس کے افعال ارادی

بعید اسباب کا نتیجہ ہیں وہ سخت منطقی دلائل سے پیدا کرتا ہے اور ایک مدت کی مشق کے بعد اپنے آپ کو اس خیال کے تابع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

عالم مادی میں انسان ایسی اشیاء میں تغیرات دیکھتا ہے جو عقل سے عاری ہیں۔ وہ ایسی حرکات دیکھتا ہے جس کا باعث وہ نہیں ہے اور ایسے نتائج دیکھتا ہے جن میں اس کا دخل نہیں ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسی قوت کے وجود کے اقرار کرنے پر مجبور ہے جس پر اُسے کوئی قدرت نہیں، جو اس سے پیدا نہیں ہوتی، اور جو اس سے زیادہ قوی ہے۔

انسان میں قوائے دماغی مادہ پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں مادہ بلا توسط انسان حرکت میں آتا ہے انسان اس کے سبب دریافت کرنے کی ٹوہ میں رہتا ہے اور اُسے وہ ایک ایسی قوت میں معلوم کرنے کی توقع رکھتا ہے جو اس سے باہر ہے اور اسی قسم کی ہے جیسی اس میں ہے۔ ایک ادنا عقل یا غیر صحیح مشاہدہ چھوٹے چھوٹے اسباب و علل میں پھنس کے رہ جائے گا۔ لیکن جوں جوں عقل روشن اور وسیع ہوتی ہے مشاہدہ زیادہ قوی اور تیز ہوتا ہے، سمجھ قریبی اور درمیانی سلسلۂ اسباب سے ہوتے ہوئے خود اس سرچشمۂ حرکت تک پہنچ جاتی ہے۔

باصرہ ایسی حس ہے جو قدرت نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو عطا کی ہے، لیکن سب میں ایک سی قوت بصارت نہیں ہوتی۔ صحیح طور سے دیکھنا آنکھ کی قوت

یا خوبی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ یہی حالت چشم بصیرت کی ہے۔ بعض معلومات کے ذریعہ سے علل کو زیادہ تیزی اور خوبی سے دیکھتے ہیں، لیکن ادنا اسباب یا علل کے خول سے نکل کر قوت اولا کے مغز تک پہنچنا تربیت یا تعلیم یا عقل کا کام ہے۔

انسان معلوم سے غیر معلوم کو دریافت کرتا ہے۔ اس لئے اس نے اس قوت کو جو نیچر میں پائی جاتی ہے اپنی قوت ارادہ کے مثل سمجھا تو اس کا ایسا سمجھنا جائز ہے۔ جب اس نے ایسے معلولات دیکھے جن کی علل کو وہ نہیں بتا سکا تو انہیں ایک ایسی قوت مختار سے منسوب کرنا جو مادہ کے اندر اور باہر ہے بالکل جائز ہے۔ یہی خدا کے خیال کی اصل ہے۔ اب خواہ خدا بہت سے ہوں اور درختوں، دریاؤں، پہاڑوں، بادلوں اور ہواؤں میں ہوں، خواہ ایک علت اعلا ہو جو کائنات کا خالق اور قائم رکھنے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بنی نوع انسان کے عام اتفاق کو گذشتہ زمانے کے الہام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اکثر اقوام ایک ہی صغرا کبرا سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچتی ہیں۔ الہام انسان کی ذات اور اصول علت و معلول کی صداقت کے یقین میں ہے اور یہ الہام ہر ذی عقل پر ہوتا ہے۔

اب ہم انسان کی دوسری تمیز طبعی پر توجہ کرتے ہیں جو انسان کو منتہائے کمال کی طرف لے جاتی ہے۔

حجریات و نباتات سب میں قوت انتخاب پائی جاتی ہے۔ ہر شے دوسری اشیا میں سے اسی سے ملتی یا اسے جذب کرتی ہے جو اس کے لئے مفید ہے۔ حجریات اور معدنیات کو دیکھا جائے تو وہ اپنے ارد گرد کی اشیا میں سے وہی چیزیں اور اسی قدر اپنے میں لیتی ہیں جو ان میں مل سکتی اور ان کے لئے مفید ہوسکتی ہیں۔ ادویہ کی کیمیاوی ترکیب کو دیکھئے۔ ہر دوا دوسری سے گھل مل نہیں جاتی۔ اسی طرح نباتات کا حال ہے۔ پودا زمین سے ہوا اور دوسری اشیا سے وہی اجزا اور اسی قدر حصہ جذب کرتا ہے جو اس کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ یہی حال دیگر حیوانات اور انسان کا ہے۔ لیکن انسان میں دو حصے ہیں مادی اور غیر مادی۔ کبھی تو وہ ان چیزوں کو انتخاب کرتا ہے جو اس کی مادی خوشی اور مادی نشو و نما کے لئے مفید ہیں اور کبھی وہ اشیا جو قوائے حصۂ غیر مادی کی نشو و نما اور مسرت کے لئے ضروری ہیں۔ اور چوں کہ اس میں دو حصے پائے جاتے ہیں اس لئے اس کی قوت انتخاب ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ کبھی تو وہ ان چیزوں کی طرف جاتا ہے جو مادی خوشی کو بڑھاتی ہیں اور کبھی ان اشیا کی طرف جو اس کی غیر مادی مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ غرض انسان ان دو کششوں کے درمیان واقع ہے۔ جدھر زیادہ زور ہوتا ہے ادھر ہی کھنچ جاتا ہے۔ ایک طعمہ، مچھلیاں دو، کشمکش آپس میں ہے۔

انسان میں یہ تخالف عجیب و غریب ہے۔ حیوانی

زندگی کا مقصد خاص اور محدود ہے۔ لہذا تمام تمیزات حیوانی اس مقصد کے پورا کرنے میں کوشش کرتی ہیں۔لیکن اس میں جو دوسری قوت ہے وہ آسے بعض اوقات اس دائرہ سے نکال کر ایک دوسرے عالم میں لے جاتی ہے۔ جہاں آس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوتا ہے۔

جس طرح تمیزات طبعی مادی زندگی کی فلاح کے لئے انتخاب کرتی ہیں اسی طرح ادراک غیر مادی حصہ کی فلاح میں بذریعۂ انتخاب مدد دیتا ہے اور یہ انتخاب ایک تمیز کرتی ہے جو روحانی زندگی کی فلاح کا خیال رکھتی ہے۔

یہ انتخاب اس طرح سے ہوتا ہے کہ چشم بصیرت کے سامنے بہت سی اشیا یا احساسات آتے ہیں، اور ان میں وہ اشیا انتخاب کی جاتی ہیں جنہیں تجربہ اور تمیز طبعی اعلا خیال کرتی ہے۔ تخیل پھر ان سب کو ملاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہیں۔ اور اس مجموعہ سے ایک منتہائے کمال قائم کرتا ہے جو جذبات کے سامنے پیش ہوتا ہے اور پھر انہیں اس طرف متوجہ کرکے ارادے کو اس کے حصول کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

دیگر حیوانات میں تخیل بہت ادنا درجہ میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ان کے سامنے حیوانی خوشی یا خطرہ کو پیش کرتا ہے اور انہیں دونوں کے حالات میں ذرا سا تغیر کرکے ان کی مختلف صورتیں ان کو دکھاتا ہے۔ لیکن انسان کی

حالت بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ بھی شہوانی زندگی تک محدود رہتا ہے تو اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے ۔ حافظہ سمجھ کے سامنے حقیقی واقعات کو پیش کرتا ہے ، لیکن تخیل اس سے کہیں آگے نکل جاتا اور نتائج تک پہنچ جاتا ہے ۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو ایک حد تک حواس کی قائم مقام ہوسکتی ہے اور چاہے تو سامعہ اور باصرہ کا کام دے سکتی ہے اور اس کی مدد سے غیر مادی حصہ اپنی سماعت اور اجازت کو بلا قید مکان و زمان ان غیر مادی صورت تک پہنچا سکتا ہے جنہیں یہ خیالی وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس پرزور قوت کو نہ کوئی محدود کر سکتا ہے، نہ کوئی روک سکتا ہے۔ یہ حقیقت اور واقعیت کے سامنے اڑتی ہوئی جاتی ہے اور ہاتھ میں اس کے مشعل ہوتی ہے جس سے رستے پر روشنی پڑتی جاتی ہے اور ارادہ اس کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے۔ تخیل امید پیدا کرتا ہے لیکن اسے سیر نہیں کرتا ۔ یہ تحقیق پر ابھارتا اور قیاس کو تیز کرتا ہے، لیکن اپنی پرواز سے نیچے نہیں گرتا ۔ دوسرے حیوانات میں بھی یہ قوت ہوتی تو وہ کچھ کے کچھ ہوجاتے لیکن چونکہ وہ کسی منتہا کا خیال نہیں کر سکتے لہذا اپنی حالت پر قائم ہیں۔

انسان میں یہ عجیب بات ہے کہ کسی خواہش کے پورا ہونے پر وہ چپکا نہیں بیٹھتا بلکہ اور آگے اور آگے بڑھتا ہے ۔ واہمہ اس کے سامنے منتہائے کمال کی ایک تصویر کھینچ دیتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لیے کوشش کرتا چلا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک انسان یا ایک قوم کا منتہا وہی نہ ہو جو دوسرے انسان یا دوسری قوم کا ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ وہ متضاد ہوں۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ جزوی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میلان ایک ایسے کمال کی طرف ہے جو ان سب کو ایک کرسکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص سرخ رنگ کو بہت پسند کرتا ہے، دوسرا نیلے کو تیسرا زرد کو، ہر ایک، ایک جزو کی طرف مائل ہے اور اس کمال کا ایک رخ دیکھتا ہے جو ان تینوں کو ملاکر ایک ایسی خوبصورت شے پیدا کرسکتا ہے جو قوس قزح کے حسن سے کم نہ ہو۔

منتہائے کمال خواہ وہ عقل کا ہو یا عدل کا ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے خیال علت و معلول نے اس کی سمجھ یا عقل کو علت انتہائی کی راہ سجھائی ہے جسے وہ خدا کہتا ہے۔ اور اس علت انتہائی میں وہ اپنے تمام ادراکات کمال کو جمع کرتا ہے اور اس طرح خدا کو قوی و قادر، علیم و بصیر اور کمال عدل و خیر و حسن سمجھتا ہے۔

کیا تخیل دھوکا ہی دھوکا ہے؟ کیا عدل و حسن و خیر کی حس جو ہم میں پائی جاتی ہے وہ کچھ بھی نہیں؟

اگر ایسا ہوتا تو انسان کی قسمت بہت بری ہوتی۔ اسے اس کا پختہ یقین ہے کہ جس طرح اس کا جسم بڑھتا اور نشو و نما پاتا ہے اسی طرح اس میں ایک روح ہے جو

نشو و نما پاتی اور ترقی کرتی ہے اور تجربے سے اسے اس بات کا یقین حاصل ہوا ہے کہ ترقی کے ہر مرحلہ پر اس پر نئی نئی مسرتوں کا نزول ہوا ہے۔ اگر انسان کے سامنے کوئی منتہائے کمال نہ ہوتا تو نہ یہ شاعر ہوتے نہ مصور ہوتے نہ مغنی۔

انسان کو فطرتاً دو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ایک علم کی دوسری محبت کی۔ علم کا تعلق عقل سے ہے اور محبت کا جذبات سے۔ عقل چاہتی ہے کہ سب میرے تابع ہوں اور میرے اشارے پر چلیں۔ جذبات کہتے ہیں کہ ہم سب کو دبا کر رکھیں اور من مانی حکومت کریں۔ مذہب کا تعلق ان دونوں سے ہے، وہ عقل سے جذبات کی روک تھام کا کام لیتا ہے اور جذبات سے عقل کے ہوش درست کرتا ہے۔

مذہب کیا ہے؟ مذہب درحقیقت ایک خیال کا اظہار ہے۔ انسان ایک علت اعلا کا خیال کرتا ہے۔ جذبات کی ہدایت اور قوت انتخاب کی مدد سے وہ ایک منتہائے خیال کا تصور کرتا ہے، اور یہ منتہائے خیال اس کی محبت و پرستش کا مرکز بن جاتا ہے۔

جہاں عقل اور جذبات میں اتحاد و اعتدال نہیں رکھا گیا وہ مذہب نہیں بلکہ ایک قسم کا فلسفہ یا کچھ اور ہے۔

جو مذہب محض استدلالی اور قیاسی ہے وہ کوئی مذہب نہیں، وہ فلسفہ ہے اور جس میں صرف جذبات ہی جذبات ہیں، وہ اکثر توہمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

مذہبی جذبات کو جب حد سے بڑھا دیا جاتا ہے تو یا تو وہ پیچیدہ اسرار ہوتے ہیں یا ایک ناواجب خوف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔ یہ دونوں مضر ہیں ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانا ٹھیک نہیں ۔ دلی جذبات کی عقل سے روک تھام کی جانی چاہیئے اور عقلی پرواز کی اصلاح جذبات سے ۔ علت العلل کی تلاش میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں ۔ ایک وحدانیت یعنی ایک خدا کی پرستش ، دوسرے کئی خداؤں کی پرستش ۔ سامی قوموں نے ایک قوت کو مانا جو تمام معلولات کی علت ہے اور آریہ اقوام نے اُن قوموں کو الوہیت کا درجہ دیا جن کا ظہور نیچر میں ہوتا ہے ۔ بعض نے اس جھگڑے کو ہار کے چھوڑ دیا اور دنیاوی بکھیڑوں میں پڑ گئے ۔

۵

مذہب انسان کی گھٹی میں بلکہ اس کی فطرت میں ہے ۔ جس طرح وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا اور اپنی حدود اور قیود کو نہیں توڑ سکتا ، اسی طرح وہ مذہب کو جو ابتدائے آفرینش سے اس میں جاگزیں ہے چھوڑ نہیں سکتا ۔ شکوک و شبہات پیدا ہوں گے ، نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہیں گی جد و جہد قائم رہے گی ، اس کے محدود حالات اس میں نئے نئے خیالات پیدا کریں گے ، لیکن آخر فتح مذہب کی ہو گی ۔ یہ یقین ہے کہ علم بدلتا رہیگا ۔ ایک قیاس ترک اور دوسرا اختیار کیا جائے گا ۔ تحقیق میں

تغیر و تبدل ہوتا رہے گا لیکن قدیم مذہب کسی نہ کسی صورت میں اس کے اندر ضرور رہے گا ۔ ممکن ہے سائنس نیچر کے متعلق نئے خیالات پیدا کرے اور خدا کے متعلق پرانے خیال کو بدل دے۔ لیکن یہ عقیدہ جو امٹ ہے خدا کے متعلق نیا خیال پیدا کرے گا کیوں کہ سائنس کا قابو یہاں نہیں چل سکتا، وہ اسے نہیں جانتا، یہ اس کی حدود سے باہر ہے۔ مذہب کی حالت ققنس کی سی ہے ۔ پیر فرتوت ہو کر وہ اپنے گھونسلے میں آگ لگاتا ہے۔ مگر انہی شعلوں میں سے پھر زندگی پاتا ہے۔ جس طرح انسان کی گزشتہ نسلوں نے نئی نئی تبدیلیاں پیدا کیں اور بہت سے رنگ بدلے مگر اپنا پرانا مذہب خواہ وہ کیسی ہی بے ڈھنگی صورت میں تھا نئی نسلوں کے سپرد کیا تو پھر نئے رنگ میں ظاہر ہوا ۔ اسی طرح ہمارا زمانہ اس میں اور صفائی پیدا کریگا، اسے اور اعلا کرے گا اور آئندہ نسلوں کے حوالہ کرجائے گا ۔ قرن درقرن اور صدی در صدی یہ کام یونہی جاری رہے گا ۔ حتا کہ کسی بعید زمانے میں وہ وقت آئے گا کہ سائنس اور مذہب کا تخالف جاتا رہے گا اور نیچر اور انسانی فطرت کا علم خدا کی معرفت پر منتہی ہو جائے گا ۔

اب ہم انسان کی تاریخ پر ابتدا سے نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا مذہب ابتدائے آفرینش سے اس میں ودیعت ہے یا نہیں ۔

ایک انگریز لڑکے ایک جاہل مسلمان ایک معمولی

ہندو یا افریقہ کے کسی وحشی یا کسی مذہب کے عالم یا فقیہ سے پوچھئے کہ مذہب کیا ہے اور پھر ان کے وجوہات کو غور سے دیکھئے تو سب کی تہ میں ایک ہی بات نظر آئے گی ، یعنی کسی ایک ذات کی پرستش خواہ وہ کسی صورت اور کسی ڈھنگ سے ہو۔ مسٹر میکڈانلڈ جو مدت تک افریقہ کی وحشی اقوام میں رہے ہیں اپنی کتاب ”افریکینا“ میں لکھتے ہیں: ”ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی شے ایسی ضرور ہے جو اس جسم سے الگ ہے اور جسے وہ روح کہتے ہیں اور موت کے بعد وہ روح اس جسم کو چھوڑ دیتی ہے۔“ اس میں کچھ شک نہیں (جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر اور دیگر فلسفیوں اور محققوں نے ثابت کیا ہے) کہ انسان بھوت پریت یا سایہ سے خدا تک پہنچا ہے اگرچہ اس کا ابتدائی خیال خوف کی وجہ سے آسے اپنے سایہ یا دوستوں اور بزرگوں کی موت یا خواب دیکھنے سے ہوا ہے اور زندگی کے درمیانی عہد میں اس نے پتھروں ، درختوں ، جانوروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سامنے سر جھکایا ہے۔ لیکن وہ کیا چیز تھی جس نے اس سے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سامنے سجدہ کرایا ؟ وہ کیا تھا جس نے اس کا سر پر زور بہتے دریاؤں یا سر بفلک پہاڑوں کے سامنے جھکایا ؟ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ ڈر ہے۔ ڈر تھا تو بھاگ جاتے چھپ جاتے، لیکن بجائے اس کے انہوں نے ایک ایسی قوت کو مانا جو سب سے قوی اور ابدی اور ازلی ہے۔ موت سے ڈر تھا تو مرنے

سے ڈرتے رہتے ، لیکن کیوں انہیں روح کا خیال پیدا ہوا ؟ اور اس سے پھر وہ اور آگے پہنچے۔ یہ خیال ان بچوں تک میں پایا گیا ہے جو الگ رکھے گئے، جنہیں کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں بتائی گئی ۔ اور نہ صرف بچوں میں بلکہ بہرے گونگوں نے بھی بلا امداد غیرے صرف اپنے خیال اور تجربے سے یہاں تک رسائی کی ہے اور ان میں خدا کا خیال اور روح و جسم کا امتیاز پایا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات انسان میں فطرتاً موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے۔

یہ کہنا کہ انسان کو خوف سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال سایہ بھوت پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہنچا لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شے تک پہنچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلا خیال، فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول ایجادات و اختراعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انہی وحشیوں تک پہنچے گی جہاں سے ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں انسان کو ارثاً ملی ہیں اور اسی طرح ایک دوسرے کو پہنچتی رہیں گی۔

٦

علمائے طبیعیات و بعض دیگر فلاسفۂ حال و قدیم کا دعوا ہے کہ صرف استقرا ہی علم کی مستحکم بنیاد ہے۔ مگر

استقرا کیا ہے؟ تجربے کے ذریعہ سے نتائج تک پہنچنا۔ لیکن ہمیں کیا حق اس امر کے ماننے کا ہے کہ چونکہ ایک ہی سے حالات میں پانچ ہزار یا دس ہزار سال سے برابر ایک ہی چیز واقع ہوتی آئی ہے تو آئندہ بھی انہی حالات میں وہی واقع ہوگا۔ یہ مانا کہ لاکھوں کروڑوں پدموں آدمی مرتے آئے ہیں لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہم بھی مرجائیں گے۔ اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ نیچر میں اصول یکسانی عالم گیر طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے اصول ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں خلل نہیں آتا۔ یہ ہمیں کیونکر معلوم ہوا؟ تجربے سے! تو گویا یہ استدلال یوں قائم ہوگا۔

ہم کیوں کسی حلقہ یا خاص اصول یا صداقت کو مانتے ہیں؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمارا یقین کیوں ہے؟

اس لئے کہ نیچر ہمیشہ ایک ہی نقش قدم پر چلتی ہے اور اس کے اصول میں یکسانی پائی جاتی ہے!

یہ ہم کس لیے مانتے ہیں کہ اصول نیچر میں یکسانی پائی جاتی ہے؟

بوجہ تجربہ کے!

تجربہ پر ہمیں کیوں یقین ہے؟

اس لیے کہ نیچر میں اصول یکسانی پایا جاتا ہے!

اسی طرح استدلال کرتے جائیے اور پھر پھر کے وہی وہ وہ آتی جائیں گی تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شے اور بھی ہے کہ جس پر انتہائی حالت میں تمام انسانی علوم کا دار و مدار ہے۔ وہ شے سب سے نیچی تہ میں ہے اور وہ تمیز فطری ہے۔ بین کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس شے سے مشابہت جو ہمارے تجربہ میں آچکی ہے، اس شے کی جو تجربہ میں نہیں آئی، ہماری نیچر (طبیعت) کے قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ قانون اس خیال کے زور سے حاصل ہوا جبکہ تجربہ نے اُسے ثابت نہیں کیا تھا۔

لہذا جس طرح مذہب کا خیال طبعی ہے سائنس بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ کیوں کہ آخری بنیاد اس کی بھی تمیز فطری پر ہے جو تجربہ سے مقدم ہے۔

صرف ایک قوت ہے جو بلا واسطہ مجھے دی گئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے، وہ قوت ارادی ہے۔ باقی جتنی قوتیں ہیں وہ بالواسطہ ہیں اور منطقی استدلال سے دریافت ہوتی ہیں۔

میری قوت ارادی دوسری قوتوں کی دریافت کرنے والی ہے۔ ہر ایک استدلال کسی ایسی قوت یا قوتوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو کائنات میں عمل کر رہی ہیں۔ اصل مسئلہ جس سے دوسرے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس پر ان کے یقینی ہونے کا دارومدار ہے وہ یہ ہے کہ میں عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور میں جانتا

ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں۔

مجھے اپنی ہستی کے متعلق منطقی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی معرفت طبعی ہے جو تمام یقینوں سے بالا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں میں وہی ہوں جو مختلف حالات اور مختلف اوقات میں سے گزر چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں خیال کر رہا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میں ارادہ کرتا ہوں اور کر رہا ہوں تمام امور معرفت طبعی سے متعلق ہیں۔ میں اپنی ہستی کا ثبوت اپنے خیالات یا ارادے سے پیدا نہیں کرتا۔ ڈیکارٹ کا یہ کہنا کہ " میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں " اس منطق سے باہر ہے۔ کیوں کہ جب میں خیال نہیں کرتا اس وقت بھی تو میں ہوں اور میرے ہونے کا علم مجھے اس وقت بھی ہے۔ میں ہوں اس لیے کہ میں ہوں۔ یہ شبہ کرنا کہ آیا میں خیال کر رہا ہوں یا نہیں یا ارادہ کر رہا ہوں یا نہیں، کوئی عقلی دلیل نہیں بلکہ بے عقلی کی بات ہے۔ یہ فلسفہ نہیں بلکہ حق ہے۔ میری ہستی کا کوئی ثبوت میری معرفت طبعی سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ معرفت میری عقلی اور اخلاقی فطرت کے لیے کافی نہیں تو دنیا کا کوئی منطقی استدلال کوئی دلیل کافی نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے شکوک کرنے سے عقل کو بے دست و پا کرنا ہے اور یہی شکوک میں جو روح کے متعلق کیے جاتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی شے غیر مادی نہیں۔ ہمارا اولین اور یقینی علم وہ ہے جو حواس کی رپورٹ سے قبل ہے اور حواس کے تابع

نہیں - لیکن جب حواس کی رپورٹ وصول ہوتی ہے تو عقل اس کی خبر دیتی ہے۔ حواس اور عقل ملکر ایک ہی وقت میں کام کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ ماد ئین کہیں کہ یہ عقل مادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کر معلوم ہوا جب کہ یہی نہیں معلوم کہ مادہ کیا ہے؟

یہ یقینی امر ہے کہ میں ہوں اور جب میں اپنی ہستی کا خود باعث نہیں تو پھر میں کیسے یہاں آیا؟ یہ کہنا کافی نہیں کہ میرے پہلے اور اسباب تھے اور ان سے پہلے اور، اور ان سے پہلے اور۔ اگر وہ سبب ان کے بعد آیا جو میرا سبب نہیں تو میں بے سبب ہوں۔ مگر تمام نوع انسان ایسی ہی ہے، تمام ہستی تمام کائنات ایسی ہی ہے۔ یعنی یا تو تمام ہستی اور کائنات ایسے ماسبق اسباب کے بعد ظہور میں آئی جن میں قوت تخلیق نہیں یا خود اپنا سبب آپ ہے۔ میں اپنی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ خیال نہیں کر سکتا کہ میں ہوں، میں خیال کرتا ہوں میں ارادہ کرتا ہوں، میں اپنے گرد اوروں میں بھی انہی تین چیزوں کو پا تا ہوں، لیکن ان میں سے کوئی یا سب مل کر بھی میرے یہاں ہونے کا سبب نہیں ہوسکتیں، میں یقیناً غیر فانی ہوں۔ میں بے سبب نہیں ہوں نہ اپنا آپ سبب ہوں۔ لہذا میرا سبب کوئی اور ہے، جو ان سب سے بالا ہے۔ سوائے اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

ہم جو کارگاہ عالم میں مختلف قوتیں دیکھتے ہیں اور جن کا ہمیں اس قدر یقین ہے، کیا ہم کہ سکتے ہیں کہ وہ کیا ہیں۔ ہم عقل اور خیال سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہم حواس سے ان کا یقین نہیں کر سکتے۔ آخر ان کا اصلی علم ہمیں کیوں کر ہوسکتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے۔ اپنی قوت ارادی سے ہم اپنے میں ایک قوت دیکھتے ہیں اور اس سے ان قوتوں کو سمجھتے، اندازہ کرتے اور یقین کرتے ہیں اور یہ تمام قوتیں ظہور ہیں اس قوت ارادی کا جو خدا میں ہے جس سے ہماری ہستی ہمارا ارادہ اور ہماری زندگی ہے۔

۷

عالم میں ہر آن تغیر ہے۔ ہر شے بدلتی ہے اور بدلنے پر مجبور ہے۔ اسی قانون سے عالم کو رونق اور ترقی ہے۔ انسان بھی اس کا تابع ہے۔ اس میں بھی ہر لحظہ اور ہر آن تغیر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ سات سال بعد وہ سر سے لے کر پاؤں تک بالکل نیا ہوجاتا ہے اور ایک ذرہ بھی پہلے کا نہیں رہتا۔ لیکن باوجود اس کے وہ پھر وہی ہے اور سمجھتا ہے کہ میں وہی ہوں اور باوجود اس کے وہ غور کرتا اور خیال کرتا ہے۔ ہر عضو کے فعل سے اس عضو میں تحلیل واقع ہوتی ہے اور اس تحلیل کے ساتھ ترکیب بھی ویسی ہی ہوجاتی ہے۔ مادہ کے کون سے سالمہ (جزو دیمراطیسی) میں مسلسل غور و فکر ہے، اس میں جو ہمارے

جسم سے خارج ہوتا ہے یا اس میں جو آتا ہے کیا آکسیجن ہائیڈروجن کا سالمہ (جزو دیمقراطیسی) معرفت طبعی کان شیس نس حاصل کرتے ہی چل دیتا ہے اور کیا آنے والا جزو دیمقراطیسی آتے ہی معرفت طبعی حاصل کرلیتا ہے؟ ضرور کوئی شے مستقل ہونی چاہئے جس میں یہ معرفت ہے اور جو غور و فکر کرتی ہے، اور جس کا ان سالمات کی مسلسل آمد و رفت پر عمل ہے، اور ادراک جس کا آلہ ہے اور جو غیر مادی ہے اور جو روح کہلاتی ہے۔ تمام حیات اس معرفت کے حاصل کرنے سے قبل صرف حرکت اور تبدیل ہیئت ہے لیکن ہم اس معرفت کو دماغ کے ذرات میں تقسیم نہیں کرسکتے۔ ہم اعصاب اور دیگر مادی ریشوں سے خاص خاص احساسات منسوب کرسکتے ہیں مگر ان اعصاب اور ریشوں سے معرفت طبعی پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ الگ مستقل شے ہے اور یہی ہے جو ہمیں اپنی ہستی کی خبر دیتی ہے اور غیر فانی ہے۔ علاوہ اس کے دماغ کے مختلف حصوں کے مختلف کام ہیں جس طرح مختلف اعصاب کے کام مختلف ہیں۔ لہذا اس معرفت طبعی کا یکساں حالت پر رہنا اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اعصاب اور دماغی اعضا ادراک کے تابع اور کارکن ہوں جو سب کا صدر نشین ہے اور سب پر حاوی ہے۔ علم فزیا لوجی (علم کاسۂ سر) جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مادیت اور دھریت کی طرف مائل کرتا ہے، اس

ہر اگر اس پہلو سے نظر ڈالی جائے تو وہ ہماری اعانت کرے گا۔

مشہور سائنس دان مسٹر ہراکٹر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص جو تھوڑی دیر کے لئے بوجہ ضرب کے بیہوش ہو جاتا ہے اور اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی تو وہ ہوش میں آکر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ غور کرنے والی شے، وہ روح کہاں تھی؟ اور یہ خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں آتا ہے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے مر گیا تھا۔ تھوڑی سی ضرب سے ایک آدمی بیہوش ہو جاتا ہے، اگر زیادہ زور سے لگے تو مر جاتا ہے۔ کیا اس وقت بھی اس میں معرفت طبعی نہیں رہتی؟ اگر ایسا ہے تو کب اور کس طرح وہ معرفت طبعی (کانشنس) حاصل کرتا ہے تھوڑی سی ضرب سے بیہوش ہوکر پھر ہوش میں آجاتا ہے؟ زیادہ ضرب لگنے سے تمام دماغی نظام بگڑ جاتا ہے اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ سائنس اس کا جواب نہیں دے سکتا کیوں کہ فی الحال یہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس سے بڑھ کر میں ایک ایسے شخص کی شہادت پیش کرتا ہوں جسے سرتاج علمائے سائنس کہنا چاہئیے اور جو عین اسی زمانہ میں جبکہ ڈارون اپنی مشہور آفاق کتاب (اریجن آف سپی شیز) لکھ رہا تھا، اپنی ذاتی تحقیقات سے انہی نتائج پر پہنچا جو ڈارون نے قائم کئے تھے اور جب اس نے اپنا رسالہ ڈارون کے پاس رائل سوسائٹی میں پڑھنے کے لئے بھیجا تو ڈارون دنگ رہ گیا۔ وہ اپنی ایک کتاب میں روحانی قوت اور علم پر بحث کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ”ہمیں

کبھی واقعات سے صرف اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے انکار نہیں کرنا چاھئے ، کیوں کہ انسانی علم کی ترقی کی تمام تاریخ اور خصوصاً وہ علم جسے ہم روحانی کہتے ھیں یہ یقین دلاتا ھے کہ جب کبھی اھل سائنس یا کسی زمانہ کے عام معلمین نے ایسے واقعات سے جو بہت سے اوسط درجہ کے ایماندار اور ذھین محققین نے خود دیکھے اور بیان کئے ھیں محض اس وجہ سے انکار کر دیا ھے کہ یہ ممکن نہیں یا وہ قانون قدرت کے خلاف ھیں تو یہ منکرین ھمیشہ غلطی پر ثابت ھوئے ھیں، چنانچہ اس فاضل عصر نے خود اس بارے میں بڑی بڑی تحقیقاتیں کیں اور بعد کامل غور چھان بین کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بے شک روحانی قوت موجود ھے اور جو مظاھر روحانی طرح طرح سے ظہور میں آتے ھیں بالکل صحیح ھیں اور نہ صرف اس نے بلکہ مشہور و معروف ڈاکٹر نوبل، سرجان فوربس اور ڈاکٹر کارپنٹر اور دیگر علما نے بعد تحقیق کے اس کی اصلیت کو تسلیم کیا۔ فاضل موصوف کا خیال ھے کہ وہ بڑے لوگ جنہوں نے اس کا انکار کیا غلطی پر تھے اور اگرچہ اکثر علمائے سائنس ان شہادتوں کی پروا نہیں کرتے اور ھنسی اڑاتے ھیں لیکن اس امر کا پورا پورا یقین ھے کہ اسی صدی میں تمام منصف مزاج تعلیم یافتہ لوگوں کو ان باتوں کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اسی فاضل نے اس کمیشن کا بھی مفصل حال لکھا ھے جو اس امر کی تحقیق کے لئے بیٹھا تھا اور جسے بالآخر تسلیم کرنا پڑا تھا کہ روحانی قوت بے شک ایک ایسی قوت ھے

جو مادہ سے الگ اور بالا ہے۔ اس کمیشن کے ممبر تمام مشہور سائنس دان تھے۔

۸

انسان جو اپنے تئیں اشرف المخلوقات سمجھتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سارا عالم یہ ساری کائنات میرے ہی لیے ہے، جس نے اپنی بساط سے زیادہ قدم مارا ہے اور اسرار عالم کے دریافت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اگر اپنی آس پاس کی اشیا پر غور سے نظر ڈالے گا تو ہر چیز نئی اور ہر اسرار معلوم ہوگی اور ایک ذرے تک کی حقیقت سے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی بے خبر پائے گا جیسے اس کائنات کی حقیقت سے۔ جب ہم اس کرہ پر نظر ڈالتے ہیں جس پر ہم آباد ہیں تو بے شک یہ بہت وسیع نظر آتا ہے اور اس قدر وسیع کہ باوجود اس ترقی اور تحقیقات کے ابھی تک ہم اس کے علم پر حاوی نہیں ہوئے۔ لیکن نظام شمسی کے مقابلہ میں یہ بہت ہی چھوٹا ہے اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کے اور نظام موجود ہیں اور یہ عالم سیارگان کے مقابلہ میں ایک نقطہ کے برابر ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کے سامنے اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ اسی طرح وقت پر نظر ڈالی جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ زمین کی نشو و نما میں جو وقت صرف ہوا وہ بے انتہا زیادہ ہے اس وقت سے جو ایک درخت کے بڑھنے اور بننے میں صرف ہوا، لیکن اگر اس وقت کا مقابلہ نظام شمسی

کے زمانہ نشو و نما سے کیا جائے تو بہت ہی کم ہے اور بمقابلہ عالم سیارگان ایک لحظہ کے برابر ہے اور ابدالآباد کے مقابلہ میں ہیچ - زمین کی ساخت کو دیکھ کر بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہیں جن سے اس کی گزشتہ حالت پر ایک گونہ صحیح رائے قائم ہوسکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بے انتہا گرم تھی - اور مختلف زمینوں کے سرد ہونے کے متعلق جو تجربے اور تحقیقات کی گئی ہیں اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس آتشیں مزاج کرہ کے ٹھنڈا کرنے میں لاکھوں اور کروڑوں برس لگے ہونگے - جب نظام شمسی کے ایک بہت چھوٹے سے کرہ کی حالت درست ہونے میں اس قدر عرصہ دراز لگا تو خیال کرنا چاہئے کہ ان کروں کے لیے جو اس سے سینکڑوں درجے بڑے ہیں کس قدر عرصہ درکار ہوا ہوگا - جب انسان یہ سوچتا ہے کہ سورج سے بھی بڑے بڑے سیارے موجود ہیں اور نظام شمسی جیسے دوسرے نظام بھی ہیں اور اس سے پرے اور نظام ہیں اور اس کے آگے اور، اور ان کے بعد اور، اور یہ سلسلہ نامتناہی یوں ہی چلا جاتا ہے تو خلائے بسیط کا خیال حد وہم سے گزر جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ زمانہ کا خیال کرتا ہے کہ ایک ادنا اور حقیر کرے کے درست ہونے میں لاکھوں کروڑوں برس لگ گئے ہیں تو اس کل نظام اور دیگر نظامات میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا تو انسان مارے حیرت کے حواس باختہ ہوجاتا ہے اور پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ عجیب و غریب حیرت انگیز کارخانہ

کس ترتیب و قاعدہ سے برابر چل رہا ہے اور تمام نظامات یک ہی اصول پر حرکت کر رہے ہیں اور کیا مجال کہ اپنی حد سے تجاوز کریں تو اُس حکیم مطلق کی حکمت و قوت کی عظمت عقل و وہم میں نہیں سما سکتی جو اس کارخانہ کا چلانے والا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک سائنس دان یہ کہے کہ یہ سب وہم ہے، کائنات میں سوائے مادہ اور سالمات کی حرکت اور کشمکش کے کچھ نہیں ہے۔ تمام عالم اور آسمانی خلا میں مادہ ہی مادہ منتشر ہے جس کی ابتدائی حالت ٹھوس ذرات کی ہے جو مختلف جسامت کے ہیں جن کی آپس کی رگڑ سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس میں سے گیس نکلتی ہے جو 'نیبولا'، (ضبابہ) کی شکل پکڑ لیتی ہے۔ یہ ضبابے نظام شمسی کے احاطۂ کشش کے اندر آ کر سورج کی مدور راہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر بعض ان میں سے ہمارے کرہ کے پاس سے گزرتے اور اس میں آ داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور ان سے شہاب پیدا ہوتے ہیں جو اکثر زمین پر گرتے ہیں۔ یہی احسام بے انتہا اصلی سیارے اور شموس ہیں۔ ان کی ترکیب انہی عناصر سے ہوتی ہے جو منجمد ہو کر بڑے بڑے ثوابت کو بناتے ہیں۔ ان شہابوں سے جو بعض اوقات ہماری زمین پر گرتے ہیں ہمیں اس مادہ کا نمونہ ملتا ہے جو تمام خلائے عالم سیارگاں میں منتشر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ بے انتہا اور کثیر شہابی مادہ جس کی وسعت خیال سے باہر ہے کہاں

سے آیا؟ اس کی حالت ما سبق کیا تھی ؟ یہ مادہ جو ابتدا میں بالکل سادہ اور اجزائے لا یتجزا کی حالت میں تھا، اس صورت میں کیسے آگیا جسے ہم عناصر سے تعبیر کرتے ہیں؟ اگر ہماری رسائی ابتدائی اجزائے عالم تک ہو بھی جائے تو بھی یہ مشکل حل نہیں ہوتی ۔ کیونکہ پھر ہمیں اُن قوتوں کی اصلیت پر غور کرنا ہوگا جن کے زور سے یہ اجزائے لایتجزا مادے اور عوالم کی صورت میں ہویدا ہوئے ۔ اس سادہ سے سادہ قوت میں کہاں سے اتصال پیدا ہوا ؟ یہ کیمیائی قوتیں کدھر سے آئیں اور سب سے بڑھ کر یہ پر اسرار قوت ثقل کہاں سے آئی جو غیر محدود ، غیر متبدل اور تمام عالم کی رونق کی اصل ہے؟ ان مسائل سے بھی بڑھ کر اہم اور لاینحل مسائل ایتھر ہیں۔ ایتھر کیا ہے اور مادہ سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟ وہ قوتیں کہاں سے آئیں جو ایتھر میں کپکپاہٹ پیدا کرتی ہیں اور جو حرارت، روشنی الکٹرسٹی کی مختلف صورتوں میں تمام تبدیل ہیئت، حرکات، سالمات اور مادے کی ان بے انتہا تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہیں جو حیات کی نشو و نما کا اصل باعث ہیں؟ ان تمام سوالات کا کوئی قطعی جواب نہیں اور غالباً کبھی نہ ہو۔

قدیم سے قدیم نظریۂ مادہ سے لیکر جدید سے جدید نظریہ پر غور کرو۔ ہر ایک میں یہی لاینحل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور کوئی اس کائنات کی علت العلل کے قریب نہیں پہنچاتا ۔ اور زیادہ سے زیادہ بقول ہربرٹ سپنسر "تمام مظاہر میں ایک نا معلوم اور نا قابل دریافت قوت

کے ظہور کا ادراک،، ہوتا ہے یا جیسا کہ اسی علامہ دھر نے اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا :- ''ہستی کی یہ خالی صورت جسے خیال نے ہر طرف اپنی بساط کے موافق تحقیق کیا ہے اور پھر اس سے پرے جہاں وہم و خیال کے پرے جلتے ہیں ، جب اس معلوم کا اس نا معلوم اور غیر محقق وسعت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو خیال کی یہ ساری تحقیق ہیچ و بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ یہ خیال اور پھر اس خلائے بسیط کا خیال جس کے مقابلہ میں ہمارے بے انتہا نظامات کی کچھ حقیقت نہیں، ایسا ہے کہ اس کے ذکر کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کچھ عرصہ سے یہ طبعی ادراک کہ یہ غیر محدود خلا بغیر کسی اصل اور سبب کے موجود ہے اور موجود رہے گا، میرے دل میں ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ اس کے سامنے میں سہا جاتا ہوں۔''

۹

مادئین کا یہ خیال ہے کہ مادہ ہی سب کچھ ہے اور مظاہر عالم کی گتھی سلجھانے کے لئے کافی ہے۔ روحانی یا الہی اثر سب فسانہ ہے۔ دیماقریطس سے لے کر اس وقت تک اس کے ماننے والے موجود ہیں اور سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے اس مذہب کو اور بھی قوی کر دیا ہے۔ ہر زمانے میں تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فلاسفہ اور علمائے علوم طبیعیات کو اس کا شوق رہا ہے کہ کوئی نظریہ ایسا قایم کریں کہ جس سے تمام اشیا اور مظاہر کی کنہ دریافت

ہو جائے اور اس خیال نے لوگوں کو مادیت کی طرف مائل کیا ہے۔ کیمیائی تحلیل نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادہ خواہ کسی صورت میں ہو اور کیسی ہی تبدیلی اس میں کیوں نہ واقع ہو جائے، نہ وہ فنا ہو سکتا ہے اور نہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح علم طبیعیات کی رو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوت خواہ کسی شکل و صورت میں ہو اور کیسے ہی مختلف حالات اختیار کر لے وہ نہ تو فنا ہو سکتی ہے اور نہ پیدا ہوسکتی ہے۔ پھر علم کیمیا کی رو سے ایسے مرکبات ترتیب دیے گئے جو اب تک بغیر قوت حیوانیہ کے دشوار سمجھے جاتے تھے اور آخر بڑھتے بڑھتے اول مادہ کے متعلق نظریہ' اجزائے دیمقراطیسی قائم ہوا اور سب سے آخر نظریہ اجزائے لاینتجزا۔ ان سب تحقیقوں اور نظریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان دہریت اور مادیت کی طرف ڈھلتا ہوا چلا گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر عالم کا باعث ہے، اور کیا اس کے ساتھ کوئی اور شے ایسی نہیں ہے جو اس سے مختلف ہے؟

اب ہمیں تحقیق یہ کرنا ہے کہ جب کسی مظہر کو دیکھتے ہیں تو مادہ کا اس میں کہاں تک دخل ہوتا ہے۔ اور ان کا باہمی کیا تعلق ہے۔ دوسرے اگر کوئی مظہر ایسا ہے جو مادے سے بالکل آزاد ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ مادہ اس کا باعث نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ اگر ہم کسی مظہر کو بغیر مادے کے نہیں پاتے تو کیا صرف مادہ ہی اس

کا کافی اور وافی باعث ہے؟ فرض کرو کوئی مظہر معلوم ہے۔ اُس کے ہم چند اسباب قرار دیتے ہیں، لیکن یہ یقین نہیں کہ آیا یہ اس کے کافی باعث ہیں یا نہیں۔ تو ہم ان اسباب کے نتائج پر غور کریں گے۔ اگر نتائج پورے اترے تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اسباب کافی ہیں اور اگر نہیں تو ہم اس شے کو تلاش کریں گے جو ان نتائج کا تکملہ کرتی ہے اور جواب تک سبب نامعلوم تھا۔ مثلاً جب سیارہ یوری نس دریافت ہوا تو بعض مہندسوں نے یہ دیکھا کہ جس طور پر وہ سورج کے گرد گردش کرتا ہے اور جو دائرہ وہ بناتا ہے اس کے لیے صرف سورج کی اور بعض چھوٹے سیاروں کی کشمکش جو یوری نس سے چھوٹے ہیں اور اس کے اور سورج کے درمیان واقع ہیں، اس گردش اور دائرہ کی کافی باعث نہیں۔ اگر صرف یہی کشش ہوتی تو وہ ایسا دائرہ نہ بناتا بلکہ اس کی صورت اور ہوتی۔ ان مہندسوں نے محض ریاضی اور ہندسہ کے زور سے یہ قیاس قائم کیا کہ ہو نہ ہو فلاں مقام پر کوئی اور ستارہ یوری نس سے پرے واقع ہے جس کی کشش کا اثر اس پر پڑتا ہے۔ چنانچہ بعد میں اس مقام پر دوربین کے ذریعہ سے وہ سیارہ دریافت ہوا جسے اب نپچون کہتے ہیں۔ اسی طور پر ہم اس عالم کو لیتے ہیں اور مادہ کو جہاں تک اس کا دخل اور صفات و اثرات ہیں پوری پوری آزادی دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا وہ اس کا کافی باعث ہے یا کوئی اور شے بھی ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے اور مادہ سے خارج ہے؟ پس اگر کوئی ایسی شے ہے تو یہ

نتیجہ نکالیں گے کہ مادہ اس عالم کا کافی باعث نہیں ہے اور اس کے بعد ہم مادہ کی حقیقت پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا وہ بذات خود قائم اور کافی ہے۔

مظاہر کائنات جن پر ہم بحث کریں گے ان کی تقسیم سرسری طور یہ ہوگی۔

۱ - قوت۔ جو ہر حرکت اتصال، اجزائے لایتجزا اور کشش کیمیاوی سے ظاہر ہوتی ہے۔

۲ - حیات۔ حیوانی یا نباتی۔

۳ - قوت۔ مدرکہ۔

۴ - ادراک طبعی (کانشس نس)

۵ - جذبات اخلاقی مثلاً محبت، رحم وغیرہ۔

ہماری سب سے اول تحقیق یہ ہے کہ کیا ہم کسی ایسے مظہر یا مظاہر کو بھی دیکھتے ہیں جو مادہ سے اس قدر الگ ہوں کہ مادہ ان کا باعث نہو یا باعث جزوی ہو؟ قوت اور حیات کے متعلق ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہم انہیں سوائے مادہ کے تعلق کے کسی اور طرح نہیں جانتے۔ اب رہی قوت مدرکہ اس کے متعلق مختلف خیال ہیں۔ بعض کا یہ مذہب ہے کہ وہ مادہ سے آزاد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ دماغ کا نتیجہ ہے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ نظام اعصابی قوت مدرکہ کا آلہ ہے اور وہ اس طور پر کہ تمام افعال ادراکی کا تعلق اس نظام کی ساخت اجزائے لایتجزا کی حرکت سے ہے اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات رہ جاتی ہے کہ آیا وہ اس کا باعث کافی ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ قوت بلا شرکت مادہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔

مگر اس میں شک نہیں کہ ادراک طبعی (کانشس نس) یعنی خالص قوت مدرکہ کا قوت مدرکہ پر غور کرنے کا فعل مادہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ اور بلا شبہ وہ جذبات جن میں غرض کا مطلق لگاؤ نہیں ہوتا مثلاً محبت یا رحم بھی مادی تعلقات سے بری معلوم ہوتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ایسے مقام پر لے جاتے ہیں جہاں مادہ سے کچھ واسطہ نہیں۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادراک طبعی (کانشس نس) کو ان دیگر ادراکی افعال سے الگ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں جن کا تعلق دماغ کے تغیرات اجزائے لایتجزا سے ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے جذبات سے ہمارے جسم اور دماغ پر کس قدر اثر پڑتا ہے مثلاً دفعتاً سر میں درد ہونا، چہرہ کا سرخ ہوجانا، نبض اور سانس کا تیز ہوچلنا، تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم مادہ کی شرکت سے بری نہیں ہوسکتے اور اسی اعتراف سے مادیین کی بن آتی ہے۔کیونکہ مظاہر عالم کہیں بلا تعلق مادہ نہیں پائے جاتے۔ اس کا لگاؤ کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طرح ضرور ہوتا ہے لیکن اس سے یہ ضرور نہیں کہ صرف مادہ ہی ان تمام مظاہر کا باعث کافی و وافی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو کون سی شے ہے جو اس کا تکملہ کرتی ہے۔

شاید یہ بات عجیب معلوم ہو لیکن بہر حال یہ باور کرنا چاہئیے کہ مادے کے وجود کی شہادت سوائے قوت مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مادہ کا وجود خود قوت مدرکہ کی اطلاع کے اور کوئی نہیں ہے۔ یعنی مادہ کا وجود خود قوت مدرکہ کا نتیجہ ہے جو وہ بعض واقعات سے اخذ کرتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف حواس کا یقین کرنا چاہئیے اور قوت مدرکہ کے نتائج کا اعتبار نہ کرنا چاہیے، انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ مادہ حس سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق قوت مدرکہ سے ہے جو حواس کے وقعات سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس امر کو مشہور فلسفی بشپ بارکلے نے نہایت خوبی کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ میں یہاں اس کے فلسفہ کو بالتفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسی قدر اشارہ پر کفایت کرتا ہوں۔

مادہ کی تین حالتیں ہیں جو قدیم سے ابتک تسلیم کی گئی ہیں۔ ٹھوس جیسے برف، سیال جیسے پانی اور دخانی جیسے آکسیجن یا ہائیڈروجن۔ بعض اہل سائنس نے ایک اور حالت بھی اضافہ کی ہے جو گیس سے بھی زیادہ لطیف ہے اور وہ شعاعی کہلاتی ہے۔

مادہ کی نسبت یہ خیال کیا گیا ہے کہ وہ اجزائے لایتجزا سے بنا ہے۔ یہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام ہیں جنمیں مادہ کے تمام خواص موجود ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو قوت اجزائے لایتجزا کہتے ہیں۔ اور ہر جزو دیمقراطیسی

کسی نہ کسی کیمیاوی عنصر کے ایک یا ایک سے زاید اجزائے لایتجزا سے بنا ہے اور ان مختلف عناصر کے اجزائے دیمقراطیسی میں جو تناسب پایا جاتا ہے وہ کیمیاوی اتصال کے قوانین کی روسے عمل میں آتا ہے۔

یہ اجزائے لایتجزا اور اجزائے دیمقراطیسی کیا ہیں؟ انسان کی آنکھ نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا ہے اور ان کے وجود کا علم ہمیں اسی طرح استدلال اور قیاس سے حاصل ہوا ہے جیسے روح کا ہے۔ جزو لایتجزا میں چند خواص و صفات مانی گئی ہیں۔

اول قوت اتصال یا کشش اجزائے لایتجزا۔ یہ وہ قوت ہے جو ہر شے کو جو جزو لایتجزا سے بڑی ہے، مجتمع رکھتی ہے۔ یہ قوت ٹھوس حالت میں زیادہ، حالت سیال میں کم اور حالت دخانی میں بالکل نہیں ہوتی۔

دوم۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ ہر جزو لایتجزا ایک ارتعاشی حرکت سے بے چین رہتا ہے اور اس حرکت کے مختلف نتائج سے مادہ کی ٹھوس، سیال، دخانی اور شعاعی حالتوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں۔

سوم۔ ہر جزو لایتجزا میں نہ صرف بیرونی حرکت ہوتی ہے بلکہ ایک حرکت اندرونی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی حرکت کل جسم یا نظام کی ہے اور اندرونی حرکت ایک حصہ جزو لا یتجزا کی دوسرے حصہ پر۔ مگر اس حرکت سے اس کی اجتماعی حالت زائل نہیں ہوتی ہے۔ یعنی یہ نہیں ہے

کہ اس کا ہر حصہ لگ ہو جائے، اس حرکت میں کپکپاہٹ پائی جاتی ہے۔

چہارم - ہر شے کے اجزائے لا یتجزا ایک ہی جسامت کے خیال کیے گئے ہیں - اور یہی وجہ ہے کہ ایک شے کا ہر حصہ ایک سا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک گیس کی دو قسمیں پیدا کرنا جو مختلف جسامت کے اجزائے لایتجزا سے بنی ہوں، نا ممکن ہے۔

اس سے مفصلۂ ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

۱- ایک شے کے اجزا سے لایتجزا بالکل ایک ہی سے ہوتے ہیں مگر دوسری اشیا کے اجزا سے مختلف ہوتے ہیں۔

۲- مختلف اشیا کے اجزائے لایتجزا جسامت میں مختلف ہوتے ہیں اور آن میں کامل تدریجی ترقی نہیں ہوتی -

۳- ایک شے کے اجزائے لایتجزا اپنی اندرونی حرکت میں توافق رکھتے ہیں اور اسی لئے اس روشنی میں بھی جو ان سے نکلتی ہے۔

۴- کسی جزو لایتجزا میں کسی عمل سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی - مادہ کی صحیح تعریف کرنا نہایت مشکل ہے اور نہ طبیعیات کی کسی کتاب سے اس تعریف کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن نظریہ اجزائے لا یتجزا کا (جو مادہ کے متعلق جدید نظریہ ہے) صحیح بیان مختصر طور پر کردیا گیا ہے۔ اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور ان میں

سے ایک جز و لا یتجزا لیتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے چھوٹا
جزو مادہ کا ہے جس میں تمام صفات و خواص مادہ کے موجود
ہیں۔ یا تو یہ سادہ یعنی مفرد ہے جیسے آکسیجن کا
جز و لایتجزا یا مرکب جیسے پانی کا جس میں دو اجزائے
دیمقراطیسی ہائیڈروجن کے ہیں اور ایک آکسیجن کا۔ اس
صورت میں جز و دیمقراطیسی ایک مرکب شے ہے کیونکہ
ازروئے علم کیمیا اس زمین پر تخمیناً ستر اشیا ایسی ہیں
جو مفرد یا سادہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں
دوسرے سے ترکیب پانے کی (بشرطیکہ وہ ترکیب پاسکے) مختلف
مقدار کا لحاظ ہوتا ہے۔ وہ بعض کو بعض شرائط پر اپنے
ساتھ ملاتی ہے اور بعض کو رد کردیتی ہے۔ غرض ہر
ایک دوسرے سے بوجہ کیمیاوی کشش و اندفاع الگ اور
مختلف ہے۔ ہم نے اجزائے لایتجزا اور اجزائے دیمقراطیسی
دونوں کو دیکھ لیا۔ ان میں کائنات کی ساخت کا اصل مسالا
نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ستر اشیا ایسی ہیں جو اپنی صفات کے
لحاظ سے الگ الگ ہیں اور جن کی ترکیب سے بےشمار ایسا مواد
تیار ہو سکتا ہے جو اجزائے لا یتجزا کے گدام کے لائق ہے۔
جز و لایتجزا کیمیاوی ساخت کے لحاظ سے اکثر مرکب ہوتا
ہے، لیکن وہ طبیعیات کی رو سے بھی مرکب ہے۔ ہم بیان
کرچکے ہیں کہ اس میں ایک اندرونی حرکت بھی ہوتی
ہے یعنی اس کے ایک حصہ کی حرکت دوسرے حصہ پر،
جس سے کہ آس پاس کے ایتھر میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور
یہ حرکت مختلف قسم کے اجزائے لایتجزا میں مختلف ہوتی

ہے۔ لہذا اجزائے لایتجزا اصل مسالا نہیں ہیں بلکہ بذات خود ایک کامل اور عجیب شے بنائی گئی ہے جسے آنکھ نے دیکھا بلکہ قیاس نے سوچ کر نکالا ہے۔

اب ایک طرف تو ہم اجزائے لایتجزا دیکھتے ہیں اور دوسری طرف سادہ اور مفرد عناصر جن سے اجزائے لایتجزا بنے ہیں۔ لیکن کہیں اصل مسالا جو تمام اشیا کی اصل ہے نہیں ملا۔ مگر باوجود اس کے ہر طرف ہم انتظام و ترتیب میں عقل و حکمت کی بین شہادتیں دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہر ہر قدم پر وہ قوی ہوتی جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ مادہ جسے عالم علوم طبیعیات و کیمیا تمام مظاہر کا باعث بتاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طبیعی اجزائے لایتجزا سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا موجود ہونا تو وہ پاتا ہے لیکن اجزائے لایتجزا میں نہیں، کیوں کہ اس نے اسے کبھی نہیں دیکھا بلکہ بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا ہے اور اس لیے اس کا خیال ہے کہ یہ صفات اجزائے لایتجزا ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک عالم علم کیمیا اجزائے دیمقراطیسی سے وہ صفات منسوب کرتا ہے جن کا ہونا تو اسے معلوم ہے لیکن اجزائے دیمقراطیسی میں نہیں۔ کیوں کہ اس نے کبھی ایک جزو دیمقراطیسی کا تجربہ نہیں کیا بلکہ انہیں بڑے بڑے مادی مجموعوں میں پایا وہ ہائیڈروجن کے جزو دیمقراطیسی میں آکسیجن سے دو اور ایک کی نسبت سے ملنے کی قوت دیکھتا ہے۔ جسے وہ در حقیقت ہائیڈروجن کے بڑے بڑے مجموعوں

میں پاتا ہے طبیعیات و کیمیا کے واقعات اجزائے لایتجزا اور اجزائے دیمقراطیسی میں ادا ہوتے ہیں۔ اور اجزائے لایتجزا اور اجزائے دیمقراطیسی از روئے تعریف کافی سبب ہیں، اُن نتائج کے جن سے کہ درحقیقت یہ اسباب استخراج کئے گئے تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے علوم بھی ہیں جو واقعات سے بحث کرتے ہیں، لیکن وہ اصطلاحات اجزائے لایتجزا اور اجزائے دیمقراطیسی میں ادا ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اور اس لئے وہ اس نظریہ پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی اُن واقعات پر جن سے وہ بحث کرتا ہے کچھ روشنی ڈالتا ہے یا نہیں۔

کیا نظریۂ اجزائے لایتجزا اس اہم اور عظیم واقعہ یعنی حیات پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے؟ جدید تحقیق کی رو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ حیات کو خواہ نباتی ہو یا حیوانی کتلتہ الاولا (پروٹوپلیزم) سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بغیر اس کے وہ کہیں نہیں پائی جاتی اور اگرچہ کتلتہ الاولا کے کیمیائی اجزاء بخوبی معلوم ہیں اور انسان انہیں اپنے ہاتھ سے ایک جگہ جمع کرسکتا ہے لیکن نہ تو کتلتہ الاولا پیدا کرسکتا ہے اور نہ حیات، جب تک کہ پہلے سے حیات موجود نہ ہو۔ اگر ہم اُن صفات کو لیں جو ازروئے جدید سائنس اجزائے لایتجزا میں پائی جاتی ہیں اور اُن کو ہزار ملائیں ہزار الٹ پلٹ کریں کبھی حیات تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ کشش اجزائے لایتجزا کی حرکت مدامی اور اُن اجزاء کی کپکپاتی ہوئی حرکت، یہ سب مل کر بھی اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے جسے حیات کہتے ہیں اور

جو خیال کی اصل بنا اور ساخت کائنات کی جزو اعظم ہے۔ سائنس نے جہاں تک تجربہ کیا ہے یہ امر بالتحقیق ثابت ہوا ہے کہ محض مردہ مادہ سے کوئی زندہ شے نہیں پیدا ہوسکتی۔

جب حیات صرف اجزائے لا یتجزا یا مردہ مادہ سے پیدا نہیں ہوسکتی تو پھر قوت مدرکہ تو کہاں ہوسکتی ہے؟ اگرچہ اکثر اہل سائنس کا یہ قیاس ہے کہ قوت مدرکہ مادہ کا نتیجہ ہے لیکن اب تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا کہ یہ کیونکر ممکن ہے۔ جب قوت مدرکہ کا یہ حال ہے تو کانسس نس (معرفت طبعی) تو اس سے بھی کہیں پرے ہے کیونکہ معرفت طبعی کے معنی ہیں قوت مدرکہ کا اپنے باطن پر غور کرنا اور یہ اجزائے دیمقراطیسی کے ترتیب دینے، ملانے اور الٹ پلٹ کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ایثار و محبت و ہمدردی کے جذبات ہیں۔

ممکن ہے کہ مادیئین میں سے کوئی یہ کہے کہ یہ سب کچھ سہی لیکن سائنس ترقی پذیر ہے اور جوں جوں اسے ترقی ہوگی مادہ کی تعریف میں وسعت ہوتی جائے گی یہاں تک کہ کسی روز وہ ان تمام مظاہر کو بیان کرسکے گا جو اس وقت مافوق فطرت معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ اگر مادہ کی تعریف میں وسعت ہوجائے گی تو اس کے ساتھ ھی یہ دلیل بھی کہ خود مادہ اس امر کی شہادت ہے کہ قوت مدرکہ اس سے قبل موجود تھی اور زیادہ قوی ہوجائے گی۔ جس قدر اجزائے لا یتجزا کی تحقیق میں زیادہ تہ کے اندر جاؤ گے اسی قدر اجزائے

لا یتجزا کے پیدا کرنے کے لیے قوت مدرکہ کی زیادہ ضرورت معلوم ہوگی - اگر نباتات اجزائے لا یتجزا کا نتیجہ ھیں تو اجزائے لا یتجزا کے وجود کے لئے بے شک قوت مدرکہ کی ضرورت ہوئی ہوگی - غرض اس مشکل کو جس طرح چاھو حل کرنے کی کوشش کرو ایک چیز ایسی ماننی پڑے گی جو مادہ نہیں ھے اور اس میں شک نہیں کہ ھم اس چیز کو مادے سے الگ نہیں پاتے - کیونکہ جس عالم کا ھمیں تجربہ ھے اس میں یہ سنگت ضروری ھے- لیکن یہ تجربہ محض یک طرفہ ھے - کائنات میں اور خود ھم میں اس امر کے اشارات اور شہادتیں موجود ھیں کہ یہ شے جو مادہ نہیں ھے عقل اور قوت مدرکہ سے تعلق رکھتی ھے اور اُسے اپنے ساتھی مادہ پر فضیلت ھے -

یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ھے کہ روح جسم کی قید سے الگ ھوکر بھی قائم رہ سکتی ھے اور اس میں شبہ نہیں کہ مادہ کا جو نظریہ اجزائے لایتجزا اور اجزائے دیمقراطیسی کے ذریعہ سے ظاھر کیا گیا ھے وہ خود ایک ایسی خالق اور منتظم قوت مدرکہ کی شہادت دیتا ھے جس کی ھستی اس سے قبل ھے اور اس سے افضل ھے -

۱۰

نظام کائنات پر نظر ڈالنے اور اپنے باطن پر غور کرنے سے ھم یہاں تک پہنچے کہ کوئی ایسی شے ضرور ھے کہ مادہ سے بالا ھے جسے ھم روح کہتے ھیں اور کوئی ایسی

قوت ابھی اور ہے جو اس سے بھی بالا اور افضل ہے اور ساری کائنات پر حاوی اور ساری ہے۔ مذہب کی اصل یہیں سے پیدا ہوتی ہے جس سے سائنس بے خبر ہے اور اس بے خبری میں اس پر حملے کرتا اور مضحکہ اڑاتا ہے۔ پچھلی صدی میں جبکہ سائنس کی ترقی معراج کمال پر نظر آتی تھی، اکثر مذہب پر حملے کرنا، اس کی ہنسی اڑانا اور اس سے نفرت اور حقارت ظاہر کرنا، اہل سائنس و فلاسفہ و حکما اور اکثر بڑے بڑے مصنفین کا عام دستور ہو گیا تھا اور یہ دستور رفتہ رفتہ فیشن ہو گیا اور یہ سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اکثر سمجھا جاتا ہے کہ مذہب بوڑھیوں کی کہانی اور بچوں کا کھیل ہے، یا ایک بیچا ہے جس کا ڈر زمانۂ طفلی سے بیٹھا ہوا ہے، یا بھوت پریت کا سایہ ہے جو اب تک اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سائنس کے پر زور اور بیجا حملوں اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے یہ یقین ہو چلا تھا کہ مذہب کوئی دن کا مہمان ہے۔ دنیا پر اب حکومت سائنس کی، وہ آن پیچیدہ مسائل اور گتھیوں کو سلجھائے گا جو اب تک لاینحل سمجھی جاتی تھیں، لیکن خود اس کے زور نے اسے کمزور کردیا۔ اور وہ نشہ جس سے اہل سائنس مخمور تھے اترنے لگا اور با وجود حیرت انگیز ترقی اور عروج کے معلوم ہوا کہ وہ بے بس ہے اور اپنی حد سے آگے نہیں چل سکتا۔ انگرسال اور بریڈلا جیسے اعدائے مذہب بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور ان کی ہفوات پر کچھ توجہ نہیں کی جاتی۔ فرقۂ ایگ ناسٹک (لا ادریہ) کے بانی پروفیسر ہکسلے کے پرزور دلائل میں اب وہ قوت

نہیں رہی اور ان کے پیرو بھی اب دھیمے پڑچکے ہیں۔
وہ نظام جو ابتدا سے انسان کے ساتھ ہے جوں جوں انسان بڑھا وہ بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اس نے دنیا میں بڑے بڑے تغیرات اور عظیم‌الشان انقلابات پیدا کیے اور اس کی ترقی میں پیش پیش رہا۔ اور یہ اب بھی انسان کی معاشرت اور تمدن کے ہر پہلو اور ہر روش میں نظر آتا ہے۔ اس کی حکومت انسان کے دل پر اب بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلی تھی اور آیندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ اہل سائنس نے اس کی طرف نہ صرف بے توجہی کی بلکہ حقارت کا اظہار کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس مہتم بالشان اور عجیب و غریب نظام پر جس کی قوت ابتدا سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور جس کی حکومت سے باوجود انکار کے بھی انسان نہیں بچ سکتا غور کرتے اور دوسرے پہلو سے نظر ڈالتے، انہوں نے سائنس کے بھرے میں اس سے منہ موڑ لیا۔ صرف ایک پہلو دیکھ کر سمجھ لیا کہ دوسری طرف کچھ نہیں۔ حالانکہ اگر مذہب کے پہلو سے انسانی ترقی پر نظر ڈالی جاتی تو منظر زیادہ وسیع اور کامل ہو جاتا۔ لیکن یہ اہل سائنس کی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا انحصار محض سائنس پر رکھا۔ حیات کی ہر حرکت اور روش کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہیں۔ جب کوئی چیز دنیا میں اتفاق سے نہیں آئی تو کیا مذاہب جنہیں انسان کی تاریخ و معاشرت میں اس قدر دخل و تصرف اور قوت ہے، مہمل

اور لغو ھیں؟ کیا انھیں انسانی ترقی و تہذیب و تمدن میں کچھ بھی دخل نہیں! یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جس پر اہل سائنس اور فلاسفہ کو غور کرنا چاہئے تھا مگر افسوس ہے کہ ان کی تنگ نظری اور ہٹ نے انھیں کبھی اس طرف متوجہ نہ کیا۔ سائنس کی لظر ہمیشہ مذہب کی طرف سے پھری رھی اور ابتدا سے جو اس نے مذھب کی مخالفت میں کمر باندھی تو اب تک وھی مخالفت چلی آتی ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ غور نہ کیا کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے بلکہ بجائے تحقیق کے جو اس کا شیوہ ہے اس نے اس جلتی آگ میں اور تیل ڈالا۔

ہم دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ھیں تو دیکھتے ھیں کہ انسان ابتدا سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے اور ایک زینے سے دوسرے زینے پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ترقی پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی عجیب و غریب اور عظیم الشان حقیقت نظر آتی ہے کہ خود انسانی خیال بھی اس کے سامنے جھجک کر رہ جاتا ہے! سب سے اول اسے حیوانات اور وحشی جانوروں سے سابقہ پڑا اور ان پر غالب آکر وہ آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتا رھا۔ مگر اس رستہ میں اسے بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلنی پڑیں، بڑی بڑی ناکامیوں اور مایوسیوں کا سامنا ھوا اور اب تک ترقی کے میدان میں اسے وھی ھفتخوان طے کرنے پڑتے ھیں اور اسے اپنے بنی نوع کے ساتھ ھر دفعہ اور ھر لحظہ وھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے جو وہ

اب تک لڑتا آیا ہے۔ یہی لڑائی ، مقابلہ یا مناقشہ اور جدو جہد ترقی اور تہذیب و تمدن کی جان ہے۔ ہر شے جس میں حیات ہے تمام امور اور خیالات میں جن کا حیات سے تعلق ہے یہی جدو جہد پائی جاتی ہے۔ تمام افعال و حرکت میں، تمام ارادوں اور نیتوں میں ، اندرونی اور بیرونی زندگی میں ، ہماری زندگی کے اعلا اور نازک موقعوں میں، ہمارا بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ کامیابی حاصل کریں اور ناکامی سے بچیں ہماری ساری طاقت اور دانشمندی اسی میں صرف ہوتی ہے۔

انسان اور دیگر تمام حیوانات میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان میں دو ایسی خصوصیتیں جمع ہیں جو کسی دوسرے حیوان میں نہیں اور اس لیے اس کا ارتقاء دوسرے حیوانات کے ارتقاء سے مختلف ہے۔ ایک تو عقل ہے اور اس ترقی میں اس کا بڑا حصہ ہے، لیکن عقل انسان کو دو باتیں سکھاتی ہے ایک تو یہ ہے کہ اس کا ذاتی فائدہ سب سے ضروری اور سب سے مقدم ہے، دوسرے موجودہ وقت بڑی چیز ہے۔ ہمارا سارا فائدہ اسی سے وابستہ ہے اور اسی میں ہونا چاہئیے۔ دوسری خصوصیت انسان میں مدنیت کی ہے یعنی وہ قابلیت جس کے اثر سے وہ اپنے بنی نوع سے مل جل کر جماعتوں میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ دو خصوصیتیں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور آپس میں ان کی مصالحت ممکن نہیں معلوم ہوتی۔ عقل کا کام تفرد ، انفعال اور فنا ہے۔ تمدن کی ترقی کے لئے ایثار اور سوسائٹی کے فائدے کو اپنے فوائد پر مقدم سمجھنا ، اپنے اغراض و فوائد کو دوسروں

کے لیے اور خصوصاً ان نسلوں کے لیے جو اب تک وجود میں نہیں آئیں ، قربانی کرنا ہے۔ یہ ایثار اور قربانی سائنس اور عقل نہیں سکھا سکتی، اس کی ہدایت عقل اور سائنس سے بالا ہے اور یہ ہدایت مذہب سے حاصل ہوتی ہے اور اس لیے انسانی تمدن و ترقی مذہب پر مبنی ہے۔ ارتقا کا مقصد جد و جہد اور قربانی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ صرف مذہب میں پایا جاتا ہے جس کی ہدایت عقل سے بالا ہے۔ عقل اس کی مخالف ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ عقل مذہب کے تابع رہ کر جدو جہد کرے۔ ورنہ اگر وہ غالب آجائے گی تو شیرازۂ نظام تمدن بکھر جائے گا۔ ارتقائے عالم میں افراد سوسائٹی کے لئے قربان کر دئے جاتے ہیں۔ عقل افراد کو اپنے فوائد کے لیے سعی کرنا سکھاتی ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ مذہب ہمیں ذاتی اور شخصی قربانی اور ایثار سکھاتا ہے نہ صرف ان لوگوں کی خاطر جو ہمارے آس پاس زندہ موجود ہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی جو آئندہ زمانہ میں آئیں گے اور ابھی وجود میں نہیں آئے ، حالانکہ یہ امر ذاتی فوائد کے خلاف ہے۔ غرض انسانی تمدن میں دو مخالف رجحانات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ایک وہ جس میں افراد کو سوسائٹی کے تابع ہونا پڑتا ہے اور دوسرا رجحان عقلی ہے۔ جسے اس اتباع میں جس کا مطلق فائدہ نہیں بلکہ زیادہ تر ایسے لوگوں کا فائدہ ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئے، تامل اور عذر ہے۔ لیکن ترقی وہی قوم کر سکتی ہے جس میں دوسرا رجحان پہلے رجحان کے تابع ہے۔ مگر اس اتباع کے لیے عقل یا سائنس کی کتاب

جد و جہد کے بعد حالت درست ہوتی ہے۔ جو شخص کسی اصول اخلاق و مذہب کا قائل نہیں ہے وہ بھی اسی سلسلۂ تمدن کی پیداوار ہے۔ اس کی نشست و برخاست بات چیت، طرز خیال، غرض کل حرکات و افعال اسی سانچے میں ڈھلے ہیں اور اسی سوسائٹی سے ارثاً، تعلیماً، صحبۃً ہیں۔ وہ ہزار زبان سے انکار کیا کرے مگر جو روش و رجحان طبعیت اس میں پیدا ہوگیا ہے وہ اسے زایل نہیں کر سکتا یعنی وہ اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ مجبور ہے اور بات بات میں اسی نظام اخلاق و مذہب کا تابع ہے جس سے وہ انکار کرتا اور جس کی تضحیک کرتا ہے۔

یونان کی عقلی ترقی دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے اور بڑے بڑے اہل آراء کی رائے ہے کہ باوجود زمانۂ موجودہ کی حیرت انگیز ترقی کے ہم ابھی تک اس درجہ کو نہیں پہنچے اور ہم اب بھی سقراط، افلاطون و ارسطو و فیڈی اس جیسے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن باوجود اس زبردست عقلی ترقی کے وہ ایسا نیست و نابود ہوا کہ گویا کبھی پتا ہی نہیں تھا۔ یہ اس لیے کہ اس ترقی میں عقل غالب آگئی تھی اور اخلاق و مذہبی اصول تابع عقل کردئے گئے تھے۔ اسی بداخلاق و بد مذہبی نے روما کو تباہ و برباد کیا۔ لیکن یہودی اور ہندو باوجودیکہ صدیوں سے محکوم اور غلام ہیں اب تک باقی ہیں اور ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے۔ روما و یونان کے زوال کی تاریخیں پڑھنے سے حیرت و

میں کوئی فتوا نہیں ملتا ۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں کہ وہ کس قدر ناپائدار اور کس قدر بے بنیاد ہے تو عقل صرف ایک فرض پر بہت زیادہ زور دیتی ہے جس کے سامنے باقی تمام خیالات ہیچ ہیں ۔ اس کی ہدایت یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عمر کے ان چند لمحوں کو کام میں لایا جائے اور حتی‌الوسع ان سے فائدہ اٹھایا جائے ۔ انسان تکلیف سے بچے ، راحت حاصل کرے اور یہ چند دم جو ہمیں مستعار ملے ہیں آرام سے بسر ہوجائیں ۔ اور اسی خیال سے انسان دولت کماتا ہے اور شہرت اور قوت حاصل کرتا ہے اور طرح طرح کے ایسے کام کرتا ہے جن سے عیش و راحت اور لطف نصیب ہو ۔ اگر یہ رجحان بے روک ٹوک ترقی کرتا رہے تو انسانی ترقی رک جائے ۔ اس لئے اسے ایک دوسرے رجحان کے تابع ہونا پڑتا ہے جس کا ذکر ہم ابھی کرچکے ہیں ۔ دنیا میں جہاں کہیں اصل ترقی ہوئی وہاں اخلاقی اور مذہبی رجحان غالب رہا اور عقل اس کے تابع رہی ۔ عقل بے شک ہماری رہبر و رہنما ہے لیکن اس کا احاطہ محدود اور اس کی نظر تنگ ہے ۔ اور اس لیے ضرورت ہے ، ایک ایسی ہدایت کی جو اس سے آگے ہمیں لے جائے اور یہ کمی مذہب سے پوری ہوتی ہے ۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مذہبی اوراخلاقی نظام کے بالکل قائل نہیں وہ باوجود اس کے نیک نیت اور مخیر اور نیک چلن ہوتے ہیں ۔ لیکن یہ امر ماننے یا نہ ماننے پر منحصر نہیں ہے ۔ انسانی تمدن یا انسانی ترقی چند اشخاص یا ایک آدھ نسل کا کام نہیں ہے قرنوموں اور نسلوں کی

عبرت ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا سبق ہے اُن اقوام کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہیں۔

انسان کی طبعیت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ایک حالت پر قانع نہیں رہتا، ایک چیز کے حاصل ہونے پر دوسری اور دوسری سے تیسری کی طرف لپکتا ہے، جب بھوک لگی تو کھانے کی تلاش ہوئی، رفتہ رفتہ جب روٹی پیٹ بھر ملنے لگی تو بھوک تو ایک طرف رہ گئی کھانے کا مدار ذائقہ پر آٹھہرا۔ اور اس چاٹ میں اس نے وہ ترکیبیں اور نزاکتیں پیدا کیں کہ کچھ انتہا نہیں۔ کپڑا بدن کی حفاظت اور راحت کے لیے تھا، اُسے اس نے وجہ زیبائش اور آرائش بنا لیا۔ وہ حقیر جھونپڑا جو سر چھپانے کے لئے بنایا تھا اب ایک شاندار محل بن گیا ہے، جس میں تمام سامان آرائش و حسن جمع ہیں۔ اسی طرح اس نے دولت، حکومت، قوت حاصل کرنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس کے دل کا مدعا حاصل ہوتا گیا اس کی ہوس اور بڑھتی گئی اور اس کے خیال کی جولانی میں اور وسعت ہوتی گئی اور ہر شے میں نئی نئی نزاکتیں اور لطافتیں پیدا ہوتی گئیں اور وہ ان میں ایسا محو ہوا کہ بالآخر یہی اس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ترقی باطن سے شروع ہوتی ہے اور انسانی تنزل بھی باطن ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ جو لوگ جسمانی آرام اور مادی راحتوں میں مبتلا رہتے ہیں وہ اسی کو اصل ترقی سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ درجۂ اسفل میں رہتے ہیں۔ اور کبھی درجہ اعلا کو نہیں پہنچتے جو ہمیشہ باطن کی ترقی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ جسم عارضی

اور فانی ھے اور اس کے ساتھ اس کی ساری خواھشں اور راحتیں اس کی ساری حکومت اور قوت بھی فنا ہونے والی ھے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح رہ جائے گی اور وہ ہمیشہ رھے گی۔ جس نے اپنی نفسانیت اور خود غرضی کو دبا کر ایثار کو ترجیح نہیں دی ، جس نے اس ھدایت کے نور سے جو مذھب کے ذریعہ سے ھوتی ھے اپنے آپ کو منور نہیں کیا اور اپنے باطن اور روح کی صفائی کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی روح عالم ارواح میں بھی ادنا حالت میں رھے گی ۔ ڈارون کا اصول ارتقا صرف جسم اور اس کے علائق تک ھے ۔ جب جسم کا خاتمہ ھوگیا تو اس کا بھی خاتمہ ھوگیا۔ اس اصول کے ماننے والوں کو اور ذرا دوسری طرف بھی توجہ کرنی چاھئے جو اصل ترقی ھے اور جس کا سلسلہ ابدالآباد تک رھنے والا ھے۔ جسم کے چھوڑنے کے بعد روح جس حالت میں یہاں تھی اسی حالت میں عالم ارواح میں پہنچتی ھے۔ اگر وہ یہاں ادنا حالت میں تھی تو وہ وھاں ادنا حالت میں رہ کر پھر ترقی کرے گی اور یہاں کی جسانی خواھشات غالباً اس کی تکلیف کا باعث ھوں گی ۔ اگر اس نے یہاں ترقی کی ھے تو ترقی یافتہ حالت میں پہنچے گی اور وھاں سے ترقی کر کے اپنے سے اعلا دوسرے عالم ارواح میں جائے گی اور اسی طرح ترقی کر کر کے اس سے بھی اعلا عوالم میں پہنچے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری رھے گا ۔ کیونکہ جس طرح سیاروں کے نظام لا تعد و لا تحصا ھیں اسی طرح نظامات روح بھی

بیحد و بیشمار ھیں - یہ ھے اصل اور صحیح اصول ارتقا جس کا سلسلہ نامتناھی ھے اور لازوال ھے - اس لئے انسان کا فرض ھے کہ وہ ادنا خیالات کو چھوڑ کو درجۂ اسفل سے اعلا کی طرف ترقی کرے جس کی ھدایت ھمیں مذھب کرتا ھے -

۱۱

غرض سائنس انسان کا کامل تعلق کائنات سے اس طور پر ظاھر نہیں کرسکتا جیسا کہ مذھب کرتا ھے، کیونکہ سائنس کا دائرہ محدود ھے - اس کی رسائی صرف مادی اشیاء تک ھے، لیکن مذھب کی حکومت بہت وسیع ھے - اور وہ مادی اور غیر مادی دونوں مملکتوں پر حاوی ھے اور اس کے اصول دور تک پہنچتے ھیں - جہاں سائنس کے پر جلتے ھیں - مذھب نہ صرف ان فرائض کو ادا کرتا ھے جو انسان کے نفس سے متعلق ھیں یا جو دوسروں سے متعلق ھیں بلکہ وہ ان فرائض کا بھی خیال رکھتا ھے جو ان لوگوں کے متعلق ھیں جو ابھی وجود میں نہیں آئے - نہ صرف یہی بلکہ وہ اس عالم سے بھی متعلق ھے جہاں ھمیں اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد جانا ھے - سائنس انسان کی روح اور روحانی عالم اور عقبا کا انکار کیا کرے کیونکہ وہ کوتاہ نظر ھے - لیکن اس کے انکار سے کسی شے کی ھستی زائل نہیں ھوسکتی - اھل سائنس اپنے بھورے برابر علم پر اس قدر نازاں اور مغرور ھیں کہ جو بات ان کے علم مین نہیں اس سے وہ جھٹ انکار کر بیٹھتے ھیں اور چند قانون قدرت جو

انہیں معلوم ہوئے ہیں ان پر اس قدر بھروسہ ہے کہ جو بات ذرا ان کے خلاف نظر آئے فوراً کہ بیٹھتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے، یہ خلاف قانون قدرت ہے۔ گویا یہ کائنات کے تمام قوانین قدرت پر حاوی ہیں۔ جو ذرا ہشیار ہیں انہوں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ہے۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نہیں جانتے یا ہمیں اس کا علم نہیں۔ لیکن یہ جواب خود ''ان سائنٹفک،، ہے۔ سائنس جستجو، تلاش اور تحقیق سکھاتا ہے۔ تحقیق سے اعراض کرنا سائنس کی ذات کے خلاف ہے۔ لیکن اہل سائنس کی یہی ہمیشہ کی عادت رہی ہے کہ جو امور ان کی تحقیق اور ان کی حدود سے باہر ہیں ان کے تو منکر ہی ہیں لیکن سائنٹیفک تحقیقات کو بھی انہوں نے ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب میں اہل مذاہب پر تو جا بجا طعن و تشنیع کی ہے کہ انہوں نے سائنس کی مخالفت کی لیکن انہیں یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ خود اہل سائنس نے تمام سائنٹفک تحقیقات کی ابتدا میں کس قدر مخالفت کی ہے۔ اور جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے اول اس کی مخالفت میں اہل سائنس آستینیں چڑھا کر آئے۔ کوپرنیکس اور ہاروے کے نام سے کون واقف نہیں؟ انہوں نے سائنس میں ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں جو تا قیامت یاد گار رہیں گے۔ لیکن ان کی مخالفت سب سے اول نہایت شد و مد کے ساتھ ان کے ہم عصر اہل سائنس

نے کی - جب بنجمین فرینکلین نے رائل سوسائٹی کے سامنے براقہ کی بحث کی تو تمام اہل سائنس نے اسے بے وقعت بتایا اور رسالہ ''فلاسوفیکل ٹریپز ایکشن،، نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کیا حالانکہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کار آمد ثابت ہوئی اور اس کا استعمال عام ہو گیا ہے - جب ینگ نے روشنی کے نظریہ انتعاشیہ کے عجیب و غریب ثبوت پیش کیے تو سائنس دانوں نے اس کی خوب ہنسی اڑائی - سر ہمفری ڈیوی نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ لندن میں گیس کی روشنی ہوسکتی ہے تو اہل سائنس نے اس کا مضحکہ اڑایا - ایسٹیون نے جب یہ تجویز کی کہ لور پول اور مانچسٹر کے ریلوے روڈ پر انجن گاڑی چلائی جائے تو اس وقت کے بڑے بڑے اہل سائنس نے شہادت میں بیان کیا کہ یہ نا ممکن ہے کہ اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ بھی ہوسکے - جب نامور اور مشہور منجم آرے گو نے برقی ٹیلی گراف کے متعلق بحث کرنی چاہی تو فرنچ اکاڈیمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اڑائی اور اسے بحث نہ کرنے دی - یہ چند عام اور معمولی نظیریں پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ جب کسی نے کوئی نئی تحقیقات کی سب سے اول اہل سائنس نے اس کی مخالفت کی - جب سائنس کے متعلق اہل سائنس کا یہ حال ہے تر روحانیت کے متعلق وہ جس قدر شد و مد کے ساتھ مخالفت کریں کم ہے - لیکن وہ امور جن کی وہ مخالفت کرتے ہیں اور جن کے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں ایک روز مسلم ہوجائیں گے

اور انہیں اپنی مخالفت پر خود افسوس کرنا پڑے گا کیوں کہ انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے ہاتھوں اپنے علم کو محدود رکھا ۔ اہل سائنس اہل مذاہب کو تعصب کا الزام دیتے ہیں ۔ لیکن ان کی ضد اور ان کا تعصب ان سے کچھ کم نہیں ۔ ان کے ذرا سے علم نے انہیں اندھا کردیا ہے ۔ تحقیق و تجسس جس پر انہیں ناز ہے وہ صرف ایک نہایت تنگ دائرہ تک محدود رکھتے ہیں اس کے آگے دیکھنے سے وہ صاف انکار کرتے ہیں اور محض تعصب کی وجہ سے اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرنا نہیں چاہتے ۔ لیکن وہ وقت آتا ہے جب انہیں مجبوراً اس خول کو توڑ کر باہر نکلنا پڑے گا ۔

غرض اگر ہم روح کی ہستی اور اس کی قوت سے جس کے متعلق بے انتہا واقعات اور بہت قوی دلائل موجود ہیں انکار کردیں اور مذہب کو جس کے اصول کی زیادہ تر بنیاد اسی پر ہے انسانی تمدن سے خارج کردیں تو انسان کی زندگی محض بے سود و بیکار اور بے برگ و ثمر رہ جاتی ہے ۔ اگر انسان صرف اسی مادی دنیا کو اور اس چند روزہ زندگی کو اپنا منتہا سمجھ لے تو کیا اُن انسانی تمناؤں کے لیے جو اس کے دل میں موجیں مار رہی ہیں یہ دنیا کافی ہوسکتی ہے؟ کیا انسانی حیات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ وہ یہاں آئے اور چند روز بری بھلی کسی طرح کاٹ کر چل دے؟ کیا علوم طبیعیات سچے اخلاق اور سچے ایثار کی ہدایت دے سکتے ہیں؟ اگر صرف مادہ ہی اصل

حقیقت ہے اور طبیعیات و ریاضیات کے قانون اس کے فرمانروا ہیں تو انسان محض ایک چلتی پھرتی کل ہے۔ اور اس کے بعد دنیا میں کوئی قوت ہے تو ایک وحشیانہ قوت ہے جو سب پر غالب آجائے گی۔ خیر و شر یا برائی بھلائی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے ذاتی یا تمدنی ذلیل و حقیر اغراض کے مطابق یا غیر مطابق ہے۔ بلکہ اس کا تطابق یا غیر تطابق اس قانون سے ضروری اور لازمی ہے جو ہم سے بالا اور الہٰی قانون ہے۔ انسان کے دل سے اس قانون کے خیال کو مٹا دو، اور خدا، حیات جاوید، انصاف و عصمت اور عذاب و ثواب کے خیالات نکال دو تو انسان کیا رہ جاتا ہے؟ صرف ایک وحشی جانور بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس میں سے ترقی کا مادہ سب زائل ہوجائے گا اور مادیت کے زہر سے سچے اور پاکیزہ اخلاق مرجھا جائیں گے۔ افسوس اُن بیچاروں پر جو ہوش سنبھالتے ہی محنت و مشقت میں جٹ جاتے ہیں، جفائیں سہتے اور مصیبتیں برداشت کرتے ہیں، کس لئے؟ اس لئے کہ چند غافل ناکسوں کے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ افسوس ان پر جن کی ساری عمر اس فکر و تردد میں کٹ گئی کہ کسی طرح دولت ملے جو اصل مسرت ہے، دولت ملی، اس وقت جب کہ آفتیں سہتے سہتے اور بلائیں جھیلتے جھیلتے کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ نہ پہلی سی سکت رہی نہ پہلا سا جوش، قوا میں اضمحلال اور عناصر میں اختلال آگیا۔ اب معلوم ہوا کہ صرف دولت مسرت کا باعث نہیں

یا اس وقت بے مانگے بلا محنت و مشقت کے ملی جبکہ جوانی کا بھوت سر پر سوار تھا اور بجائے مسرت کے زحمت اور آفت کا باعث ہوئی ۔ کاش ضبط نفس ہوتا ، تھوڑی سی قناعت اور اعتدال پر نظر ہوتی ! دولت اور دولت سے جسمانی عیش انتہائے مسرت کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے ۔ لیکن حصول دولت و عیش کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا ۔ خود اس میں اس قدر بلائیں اور آفتیں بھری ہیں کہ خوشی مفقود ہوجاتی ہے ۔ اصل خوشی اعتدال ، قناعت اور ضبط نفس میں ہے ، بشرطیکہ انسان کسی مقصد اعلا کے حصول میں مشغول ہو ۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ باطن کی روشنی کی جھلک سے بیرونی حالات پر اثر پڑے ۔ بیرونی حالات کے موافق کر لینے اور مادی سامان کے حصول سے جو لوگ دل کو مطمئن اور با مسرت بنانا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں ۔ دل کی خواہشات کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ ہے ، بلکہ کام دوسری طرف سے شروع کرنا چاہئیے ۔ اپنے ارادے میں قوت نفس پر جبر اور ضبط حاصل کرنا اور خواہشات نفسانی کو اس کے تابع بنانا چاہئیے تاکہ قلب کا اثر مادی حالات و خواہشات پر پڑے اور وہ اس کے لطف و مسرت کا باعث ہوں ۔ اسی وقت اعتدال و قناعت نصیب ہوگی اور کام میں سہولت و استقلال پیدا ہوگا ۔ لیکن اس سے بھی اعلا مسرت انسان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بے نفسی اور بے غرضی سے کام

لیتا ہے۔ حیات انسانی کی تہ میں رنج و الم ہے۔ انسان ہر طرف سے خطرے اور بے اطمینانی سے گھرا ہوا ہے اور زیادہ تر وہ جو کھیل اور تفریح اور دیگر اشغال میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے وہ اپنے آپ کو بھلائے رکھے اور دلی کاوشوں کی طرف اس کا خیال نہ جائے۔ انسانی فطرت کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ انسان خوشی کی تلاش اور حصول سے نہیں بلکہ اپنی مصروفیت سے آلام زندگی کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہ عام مصروفیت ادنا درجہ کی ہے۔ اعلا درجہ اس کا اس وقت حاصل ہوتا ہے جب‌کہ وہ بے غرض اور بے نفس ہوتا ہے اور دوسروں کو مسرت اور خوشی پہنچانے کے لئے اپنے تئیں بھلا دیتا ہے۔ مذہب کی زبان میں اسے ثواب کا کام کہتے ہیں۔ وہ ایک تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی ہمدردی اور اخلاق کے اعلا طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے خیال میں وہ اپنے آپ کو قربان کردیتا ہے سچے مذہب کی تعلیم یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مذہبی آدمی کی خوشی زیادہ پائدار اور مستقل اور بے غل و غش ہوتی ہے اور اسے اپنے کام پر زیادہ اطمینان ہوتا ہے۔ وہ گذشتہ کا شکر اور حال پر قناعت کرتا اور آئندہ کی توقع رکھتا ہے، بخلاف اس بوالہوس دولت کے بندے کے جو گذشتہ پر پچھتاتا اور حال میں مذبذب اور بے اطمینان رہتا ہے اور آئندہ زمانہ اسے تاریک نظر آتا ہے۔

۱۲

ہم نے جو گذشتہ اوراق میں انسان کی مذہبی اور روحانی قوت پر بہت زیادہ زور دیا ہے تو اس کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ عقل یا سائنس و فلسفہ بیکار یا گمراہ کرنے والے ہیں بلکہ اس رخ پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ آج کل سائنس کی چکاچوند سے لوگوں کی نگاہ اس قدر خیرہ ہوگئی ہے کہ وہ دوسرے رخ پر نظر نہیں ڈالتے ورنہ سائنس و فلسفہ کے کار آمد ہونے سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اور مادی ترقی سے اس نے انسانی تمدن کو جو مدد دی ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ محض سائنس کی ترقی انسانی ترقی نہیں ہوسکتی، اور نہ اُسے اُس رتبہ پر پہنچا سکتی ہے جو اس کا اصل منشأ و منتہا ہے۔

پھر سائنس اور مذہب میں اختلاف و مخالفت کیوں ہے؟ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اس اختلاف و مخالفت کی کوئی وجہ نہیں یہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مذہب کی بنیاد مافوق العادۃ پر ہے اور سائنس کی بنیاد عقل پر۔ اہل مذہب سائنس سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ سائنس کے اصول اور ان کے انکشافات مذہب کو کمزور اور زائل کردیں گے۔ حالانکہ یہ خیال محض باطل ہے۔ سائنس صدھا سال سے برابر ترقی کرتا چلا آتا ہے۔ لیکن وہ مذہب کی بنیاد کبھی نہ ہلا سکا۔ مذہب کی قوت ابھی تک ویسی ہی قائم ہے اور قائم رہے گی اس لیے کہ جس

شے پر مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہے خیال مافوق العادۃ عقل سے باہر ہے اس لئے کہ اس کا تعلق دل سے ہے دماغ سے نہیں۔ اور یہ ایک ایسا وجدان قلب ہے جس میں غیر محدود کے محسوس کرنے کی قوت ہے حالانکہ عقل بذاتہ محدود ہے۔ غیر محدود یعنی خدا کا دیکھنے اور پہچاننے والا دل ہے۔ عقلی استدلال سے اس کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اولہ و براہین اسی کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہیں جس میں پہلے سے یہ وجدان ہے اور خدا کو مانتا ہے۔ جو نہیں مانتا اس کے لئے تمام دلائل بیکار ہیں۔ لہذا اہل مذہب کو سائنس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اور آسمان پھرتا ہے تو مذہب کو اس سے کیا تعلق؟ اگر کوئی نیا ستارہ دریافت ہو تو مذہب پر اس کا کیا اثر؟ اگر زمین کے اندر سے نئے نئے آثار متحجرا نکلیں اور ان سے انسان کی قدامت پر روشنی پڑے تو مذہب کو اس سے ڈرنے کی وجہ؟ اگر کشش ثقل نے سائنس میں انقلاب پیدا کیا اور بہت سے مسائل عالم کو حل کیا تو بہت مبارک، مذہب اس سے کیوں خائف ہو؟ اور نظریۂ ارتقا انسان کی ترقی کے اصول کو بتاتا ہے تو بتائے مذہب کیوں اس سے گھبرائے۔

جب مذہب کی حالت ایسی مستحکم اور قوی ہے تو پھر اہل مذاہب کیوں اہل سائنس سے لڑتے اور جھگڑتے اور ان پر ارتداد و کفر کے فتوا لگاتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف ایک معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چونکہ مذہب

انسان کے ساتھ اس وقت سے ہے جب سے اس نے ہوش سنبھالا اور جب کہ سائنس کا نام و نشان بھی نہ تھا اس لئے مذہب کو علاوہ روحانیات و معاشریات کے وہ کام بھی کرنا پڑا جو سائنس سے مخصوص تھا ۔ غرض ابتدا میں مذہب روحانی ، اخلاقی ، معاشرتی ، سیاسی اور سائنٹفک تمام انسانی شعبوں پر حکومت کرتا رہا ۔ اور مذہب کا ہادی معلم بھی تھا ، فلاسفر بھی تھا اور حاکم بھی تھا ۔ لیکن مذہب و اخلاق کو چھوڑ کر باقی امور ضمنی تھے اور وہ مجبوراً مذہب مین داخل کر لئے گئے تھے ۔ انسان نے جب ترقی کی اور اس کا تجربہ اور تمدن وسیع ہوا تو ہر ہر شعبہ الگ ہونا شروع ہوا اور ان میں نئی نئی باتیں اور نئے نئے انکشافات ہوئے ۔ اہل مذاہب نے جب یہ دیکھا تو یہ امر نا گوار گزار اور وہ یہ سمجھے کہ ان کی یہ ترقی ہماری مخالفت میں ہے جو امور ابدان و حفظان صحت کے کے متعلق تھے وہ علم طب نے سنبھال لئے ، جو ملکی تھے وہ علم سیاست نے نئے اور جو نجوم و شموس و قمار کے متعلق تھے وہ ملکیات کے تحت میں آ گئے ، مگر اہل مذاہب ایک مدت تک انہی باتوں پر جمے رہے جو ابتد میں ضمناً ان علوم کے متعلق مذہب کی ذیل میں آ گئی تھیں اور علمی ترقی سے انکار کرتے رہے اور اس کی ترقی کو مذہب کی مخالفت اور استیصال کا باعث سمجھتے رہے ۔ لیکن درحقیقت ان امور کو نہ پہلے مذہب سے تعلق تھا اور نہ اب ہے اور ان کی ترقیاں نہ مذہب کے راستے میں حائل ہوسکتی ہیں ۔ اور

نہ اُسے کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں کیوں کہ سائنس مذہب پر کسی طرح نہ حملہ کرسکتا اور نہ سے نقصان پہنچا سکتا ہے، اس لئے کہ جس پرچیز مذہب کی بنیاد ہے وہ سائنس کی دسترس اور رسائی سے باہر ہے۔

اب رہی سائنس کی مخالفت مذہب سے۔ سو یہ بالکل بیجا اور محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی ہے، کیونکہ سائنس مذہب کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ سائنس استدلال عقلی پر مبنی ہے اور سب چیزوں کو اسی سے پرکھتا ہے۔ جو چیزیں اس کے اصول پر پوری نہیں اترتیں ان کے ماننے سے انکار کردیتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ صرف عقل ہی ایک خصوصیت انسان کی نہیں بلکہ اس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور اور احقاق حق میں صرف عقل ہی پر دارو مدار نہیں ہوتا بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ انسان کی اخلاق روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ مثلاً حسن کی دریافت کے لئے ذوق ایسا ہی ضروری ہے جیسی عقل۔ احقاق حق میں عقل وہیں تک کام دیتی ہے جہاں تک سلسلۂ علت و معلول کا تعلق ہے۔ لیکن جہاں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے تو وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں عقل حالات و عادات و اغراض سے بھٹک جاتی ہے تو ان معاملات میں اس کی کیا پیش جاسکتی ہے جن کا زیادہ تر تعلق تمیز و وجدان پر ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد، فوق العادۃ پر ہے جو عقل سے بالا ہے اس لئے سائنس وہاں نہیں پہنچ سکتا اور اپنی نادانی

اور نافہمی سے اس پر حملہ کرتا اور اس کے ماننے سے انکار کرتا ہے۔ ایک بات اسے اور ہاتھ لگ گئی ہے۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہ اٹھتا ہے کہ یہ خلاف قانون فطرت ہیں۔ گویا تمام قوانین فطرت اس کے دیکھے بھالے ہیں۔ اور وہ اُن سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ اول تو اس کرہ کی جس پر ہم آباد ہیں بساط ہی کیا ہے، دوسرے جو چند قانون فطرت ہمیں معلوم ہیں بالکل محدود ہیں اور وہ صرف مادی حالت سے متعلق ہیں۔ عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اس پر ہے اوربھی محدود ہے، اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسے ہوسکتی ہے۔ وہ مادی حالت سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے اگرچہ اس کے متعلق بھی اس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس محدود علم اور یک طرفہ علم پر اس کے یہ دعوے ہیچ ہیں اور بغیر اس کوچہ میں قدم رکھے جو مادہ سے بالا ہے اور بغیر اس تحقیق و معرفت کے جو اس دائرہ میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہوسکتی اس کا انکار نا قابل سماعت ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کا مذہب کا منکر یا مخالف ہونا سراسر نادانی و نا فہمی ہے۔ اہل سائنس کو زیادہ عالی ظرفی، زیادہ وسیع النظری، زیادہ حوصلہ و تحمل اور زیادہ تحقیق و تجسس سے کام لینا چاہئے۔ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ کہدینا کہ آفتاب کا وجود ہی نہیں اور جب دوسرے اس کے ہونے کی شہادت دیں تو انہیں جھٹلانا سائنس اور فلسفہ کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر با وجود کثرت واقعات و

دلائل وہ اپنے انکار پر مصر ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعصب اور ان کی ہٹ دھرمی مذہبی تعصب اور ضد سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔

جس طرح علمائے طبیعیات و مریدان ارتقا کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائیں اور اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں ۔ اسی طرح اہل مذاہب کو بھی چاہئے کہ وہ احتیاط سے کام لیں اور اپنی حد سے تجاوز نہ کریں ۔ ایک حد ہے جہاں مذہب کو رک جانا چاہئے ۔ اور ایک حد ہے جہاں سائنس کو ٹھہر جانا چاہئے ۔ اور یہاں پہنچ کر سائنس اور مذہب نہ صرف اپنے پرانے قصے قضیئے اور عداوتوں کو بھلادیں ، بلکہ دو روٹھے ہوئے بھائیوں کی طرح من جائیں ۔ عالم طبیعیات کو ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، قبل اس کے کہ وہ کائنات کے مسلے کو حل کرے ، اور اسی طرح اہل مذاہب کو بھی ۔ ان کا منشا ایک ہے ۔ یعنی انسان کی ترقی اور بہبودی لیکن ایک کا مقصد مادی اور ظاہری ترقی ہے اور دوسرے کا مقصود باطنی اور روحانی ترقی ۔ ایک استدلال عقلی اور استقرا کے رستہ اپنی منزل مقصود کو پہنچتا ہے اور دوسرا جذبات اور تخیل کی راہ سے ۔ لیکن کسی کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو خارج کردے۔ کائنات کی انتہائی صداقت کا معلوم کرنا کوئی بری بات نہیں اور جو کوئی اس میں کوشش کرتا اور مدد دیتا ہے بہت اچھا کرتا ہے۔ اگر خدا کا خیال ہمارے دل و دماغ

میں جاگزیں ہے تو نیچر اسے نکال نہیں سکتی۔ روح اسے ضرور یہیں پائے گی۔ اور جو شخص اس کوشش میں ہے کہ اس خیال کو نکال دے اور خدا کو کائنات سے خارج کردے، وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

جھگڑے، تنازع اور جد و جہد سے ڈرنا نہیں چاہئیے۔ صداقت اختلاف کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اہل مذاہب کا ضعف اس میں ہے کہ وہ سائنس سے ڈرتے ہیں، حالانکہ وہ ڈرنے کی چیز نہیں بلکہ اس سے مدد لینا اور اسے معاون بنا کے رکھنا چاہئے۔ اگر اس کے کہیں دشمن ہیں تو ان سے مقابلہ کرنا چاہئیے۔ بھاگنے سے شکست بہتر ہے کیوں کہ ممکن ہے کہ شکست سے فتح ہو جائے، مگر بھاگنے سے گمنامی کا احتمال ہے اور گمنامی سے موت کا ڈر ہے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مذہب میں ہم زیادہ ترقی اور روشن خیالی کو دخل دیں گے اور اسے توہمات باطلہ اور تمام غیر ضروری کثافتوں سے پاک کردیں گے تو اس کی فتح ہی فتح ہے۔ اسی طرح سائنس کا ضعف اس میں ہے کہ اپنے محدود علم پر تکیہ کرکے بے سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کے اصول مذہب پر حملہ کرتا اوراس کے خیالات سے انکار کرتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ انسان کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالے جس سے مذہب بحث کرتا ہے تو اس کی نظر اور وسیع ہوگی اور وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی آنکھیں بند کرے گا اور اپنے دل و دماغ میں روشنی نہیں پہنچنے دے گا تو بلا شبہ اس کی قسمت میں ہار ہے، یہ

وقت ہے اس کی ہمت آزمائی کا۔ تحقیق و تجسس اس کے اصل اصول ہیں۔ اسے چاہئیے کہ وہ انہیں اپنے محدود دائرے سے اور آگے بڑھائے اور قدرت حق کا تماشہ دیکھے۔ اسے اب صداقت کے ماننے کے لئے تیار ہونا چاہئیے اور زیادہ عالی ظرفی اور روشن خیالی سے کام لینا چاہئیے اور خلا اور نفسانیت سے دست بردار ہونا چاہئیے۔

بقول پروفیسر ٹیٹ و بالفور اسٹیوارٹ جو اس زمانے میں سائنس کے بہت بڑے عالم ہیں، اس کائنات میں ایک قانون توال یا عدم انقطاع موجود ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کرلی جائے تو تمام عالم درہم برہم ہوجائے گا اور یہ ہستی محض بیکار اور مہمل ہوجائے گی۔ یہ مادی عالم صرف مادہ ہی سے نہیں بنا بلکہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جس پر اس کا دارومدار ہے، اور وہ توانائی ہے۔ لیکن ہمارے لئے یہ توانائی اسی وقت کارآمد ہے جبکہ یہ تبدیل ہئیت کرتی رہے، لیکن تجربے سے یہ ثابت ہے کہ توانائی کی تبدیلی اسے کمزور کردیتی ہے۔ یہ بیشک ممکن ہے کہ توانائی کو ہم حرارت میں تبدیل کرلیں اور اس سے کام لیں۔ لیکن ہر ایسی تبدیلی قوت حرارت کو کمزور کردیگی اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہوجائے گا۔ سورج ہمارے نظام کا منبع حرارت اعلا ہے اور وہ قوت جس پر ہماری حیات کا دارومدار ہے، اس حرارت سے اخذ کی جاتی ہے جو سورج سے نکلتی ہے۔ جبکہ سورج ہمارے لیے توانائی مہیا کرتا رہتا ہے تو وہ خود سرد ہوتا جاتا ہے اور آخرکار اس طرح خلائے بسیط

میں حرارت نکالتے نکالتے اس میں سے وہ حیات قائم رکھنے والی قوت زائل ہوجائے گی جو اس وقت اس میں موجود ہے۔ علاوہ سورج کے سرد ہونے کے ہمیں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایتھری رگڑ کی وجہ سے ہماری زمین اور ہمارے نظام کے دوسرے کرے بالتفاوت سورج کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ ہر ایسی حالت میں تصادم سے حرارت پیدا ہوگی اور عارضی طور پر سورج کی بجھی ہوئی قوت پھر بحال ہوجائے گی اور آخر ایک روز یہ سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا، اور وہ بجھ بجھا کے رہ جائے گا، یہاں تک کہ از منۂ بے شمار کے بعد اس کے پھر کسی پڑوسی کرے سے مڈ بھیڑ ہو اور اس کی جان میں جان آئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حرارت کا یہ ازالہ ایک روز ہمارے نظام کا خاتمہ کردے گا۔ تو پھر کیا اس سے وہ قانون عالم جسے قانون توال یا عدم انقطاع سے تعبیر کیا گیا ہے نہیں ٹوٹ جائے گا؟ ایسی حالت میں وہ تسلسل جو برابر جاری رہنا چاہئے کہاں رہا؟ لیکن اگر صرف یہ عالم ظاہر ہی سب کچھ ہوتا تو بیشک یہی صورت واقع ہوتی۔ لیکن اب سائنس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کے اور اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ایک ایسے عالم کو بھی محسوس کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے اور اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ان قوانین کی تکمیل کے لیے جو اس نے دریافت کیے ہیں ایک غیر مرئی روحانی دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ اسی قانون توال سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ

غیر مرئی عالم سے قبل ہوگا کیونکہ مرئی عالم کی کوئی ابتدا ہونی چاہئے - اب یہاں مذہب یا الہام اور سائنس کی سر گوشیاں شروع ہوتی ہیں - مذہب کہتا ہے کہ عالم ایک وقت میں خلق کیا گیا تھا - سائنس کہتا ہے کہ جس طرح یہ عالم اس وقت ہے ہمیشہ سے یہ ایسا نہیں ہوسکتا - مذہب کہتا ہے کہ دنیا اور اس کی کائنات سب مل کر خاک ہوجائے گی - سائنس اُن قوانین کی رو سے جن کی حکومت اس دنیا پر ہے یہ استدلال کرتا ہے کہ موجودہ نظام کا انجام یہی ہونے والا ہے - مذہب کہتا ہے کہ ایک روحانی دنیا بھی ہے جس کا اس دنیا سے گہرا تعلق ہے اور ہماری حالت پر اس کا اثر پڑتا ہے - سائنس بھی اب دبی زبان سے کہنے لگا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ انسانی قانون ملیا میٹ ہوجائیں گے اور اپنے ہاتھوں آپ اپنی قبر بنائیں گے - کیونکہ قانون توالی یا عدم انقطاع کا مقتضا یہ ہے کہ اگر یہ موجودہ کائنات برباد و تباہ ہوگی تو اس غرض سے کہ وہ دوسری جگہ ایک جدا سلسلۂ قوانین کے تحت میں اپنی ہستی حاصل کرے اور نئے قانون نشو و نما میں پھولے پھلے - اور یہی اصول افراد پر بھی صادق آتا ہے اور اسُ لئے بلا کسی مذہبی خیال کے روح کے غیر فانی ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو موت انسانی ترقی کی حائل اور مانع نہیں ہوسکتی اور یہی آخرت یا عقبا ہے -

یہاں سائنس و مذہب کا وہ عناد و مخالفت جس کا

اس قدر شور و غلغلہ مچا ہوا ہے اور جس پر ڈاکٹر ڈریپر نے فصاحت کے دریا بہادئے ہیں، کافور ہو جاتی ہے۔ سائنس اب تک ایک گنبد بے در میں چکر لگا رہا تھا۔ اب آدھر کی تھوڑی سی جھلک پہنچنی شروع ہوئی ہے، وہ آنکھیں مل مل کے دیکھ رہا ہے کہ یہ نئی شے کیا ہے، وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کی بصارت روشن اور اس کی بصیرت منور ہوجائے اور مذہب سے آکر بیعت کرے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو سائنس اور مذہب کی مخالفت محض غلطی اور غلط فہمی پر ہے اور طرفین نے اس میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ بجائے سلجھانے کے اور الجھن پیدا کردی ہے۔ سائنس کے جدید اور عجیب انکشافات اور انوکھے قیاسات اور نظریات سے جن پر اہل سائنس کو بڑا فخر ہے اہل مذاہب گھبرا گئے کہ سائنس ہمارا جانی دشمن ہے کیوں کہ وجہ یہ ہے کہ سائنس کے ہر جدید انکشاف کا یہ ناگزیر نتیجہ ہوا کہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے، اور ان جدید انکشافات سے اس حالت میں تزلزل پیدا ہو گیا جس پر پہلے سے ایمان لائے بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ اس حالت کو مذہب سے تعلق نہ ہو، لیکن چوں کہ اسے قطعی اور یقینی سمجھ چکے تھے، لہذا مذہب اور الہام کو بھی اسی پر ڈھال لیا تھا اور جب اسے ٹھیس لگی تو شور و غل مچانا شروع کیا، اور مخالفت کی ایک نئی بنیاد قائم ہو گئی اور یہ سمجھ لیا کہ یہ مذہب کی عین مخالفت ہے، حالاں کہ اسے مذہب سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ اہل

مذاہب کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور الہام ربانی کو ہمیشہ گڈ مڈ کردیتے ہیں اور جہاں ان کی رائے پر بھی حملہ ہوا تو اسے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب پر حملہ ہے۔

لیکن صرف اہل مذاہب ہی غلطی پر نہیں ہیں بلکہ اہل سائنس بھی اسی غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اہل سائنس اہل مذاہب کے اجتہادات اور رایوں کو الہام ربانی سمجھتے ہیں اور اس لیے ان رایوں کی غلطی ثابت کردینے سے وہ سمجھتے ہیں کہ الہام ربانی کو غلط ثابت کردیا۔ زیادہ تر خطرہ ''نیم حکیم،، اہل سائنس سے ہے جنہوں نے کبھی آنکھ اٹھاکر دوسری طرف نہیں دیکھا۔ اور جو سائنس کے قیاسات کو بھی تعینات سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مذہب سائنس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا، اور ان میں ہمیشہ مخالفت رہے گی۔ اگرچہ بعض اہل سائنس جنہیں خدا نے اعلا دماغ عطا کیا ہے، یہ سمجھتے جاتے ہیں کہ مذہب و سائنس میں کوئی مخالفت نہیں اور وہ اس مادی عالم کے پرے ایک اور عالم کے بھی قائل ہوتے جاتے ہیں جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ڈریپر کی یہ کتاب ''کان فلکٹ بٹوین سائنس اینڈ رلیجن،، (معرکۂ مذہب و سائنس) درحقیقت سائنس کی پرزور حمایت ہے، لیکن فاضل ڈاکٹر نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جسے وہ مذہب کہتے ہیں وہ درحیقت مذہب نہیں بلکہ رومن ازم ہے اور جتنے حملے انہوں

نے مذہب پر کئے ہیں وہ بلا شبہ رومن ازم پر ہیں ، بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ عام مذہب تو کیا خود مسیح کے مذہب پر بھی ان حملوں کا اطلاق نہیں ہوسکتا ۔ اس لئے کہ جب یہ بنیاد ہی غلط ہے تو وہ شاندار عمارت جو انھوں نے اس بنیاد پر قائم کی متزلزل ہوکر دھڑام سے گر پڑتی ہے ۔

سائنس و مذہب کا یہ اختلاف اور ان کی باہمی بدظنی و بد گمانی ابھی مدت تک رہے گی اور اسے سہنا چاہئے ۔ لیکن ساتھ ہی اسے رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے ، کیوں کہ اس کی بنیاد غلط فہمی اور ہٹ دھرمی پر ہے ۔ اہل مذاہب کو سائنس کی صداقت پر اور اہل سائنس کو مذہب کی صداقت پر ایمان لانا چاہئے اور ایک روز آنے والا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اپنی نادانی پر پچھتائیں گے اور اپنی حرکات سے شرما کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیں گے ۔ پھر سائنس کو مذہب سے اور مذہب کو سائنس سے کچھ عناد نہ ہوگا، اور یہ توام بھائی ایک جان دو قالب ہوجائیں گے ۔

۱۳

لیکن ایک مشکل اور ہے ۔ سائنس کے اصول میں تو کیا فروع میں بھی بہت کم اختلاف ہے سوائے ان امور کے جو قیاسی ہیں ۔ کیونکہ وہ مشاہدے، تجربے اور

استقرا پر مبنی ہیں ۔ حالانکہ مذاہب کا یہ حال ہے کہ ہر ایک نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی ہے۔ ان بے حد اور بے شمار اختلافات میں یہ مشکل آپڑی کہ سچا کسے سمجھا جائے ، اور صداقت کا پتا کہاں ملے ۔

پروفیسر میکسس مولر نے ایک جگہ دنیا کی زبانوں کے متعلق بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن انسان کی تاریخ میں کوئی زبان اب تک نئی نہیں بنی ۔ قدیم سے جو الفاظ چلے آتے ہیں وہی اب تک چلے آتے ہیں ۔ انہی میں کچھ ہیر پھیر اور رد و بدل کر لیا جاتا ہے۔ بعینہ یہی حال مذاہب کا ہے۔ ہمیشہ نئے نئے بنتے رہتے ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ لیکن غور سے دیکھو تو اصل وہی ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے البتہ کچھ ردو بدل کر لیا گیا ہے۔ اختلافات صرف اُن ممالک اور ان اقوام کی وجہ سے ہیں ، جن میں مذاہب رائج ہوئے یا اُس زمانے کی وجہ سے جبکہ مذاہب کی اشاعت ہوئی ۔ اگر ابتدا سے لیکر تمام مذاہب کو سلسلہ وار جمایا جائے تو یہ اختلاف کا مسلہ صاف طور سے سمجھ میں آجائے گا ۔ ملک اور قوم اور زمانے کی وجہ سے جو خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں وہ اگر نکال دی جائیں تو پھر مشکل سے کوئی اختلاف باقی رہتا ہے ۔ اور اگر اختلافات ہیں بھی تو وہ انسانی خیال کی ترقی کے مراحل کو ظاہر کرتے ہیں ۔ اور اس لیے وہ رد کرنے یا خارج کرنے کے قابل نہیں بلکہ ایک منظم سلسلہ میں آنے کے قابل ہیں ۔

اس وقت کسی جدید مذہب کے قائم کرنے یا جدید صداقتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل حق ظاہر کرنے کے لئے صداقت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب کی ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کام کو اسلام نے خاطر خواہ انجام دیا ہے۔

مذہب کے لئے سب بڑی آفت مبالغہ ہے۔ ایک مذہب نے کسی ایک خوبی کو لیا اور اسے آسمان پر چڑھا دیا اور دوسری خوبیوں کو بالکل نظر انداز کردیا۔ دوسرے نے کسی دوسری خوبی پر اس قدر زور دیا کہ باقی خوبیوں کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ یہودی مذہب نے ظاہری ارکان کی پابندی میں اس قدر مبالغہ کیا کہ باطنی صفائی پس پشت جا پڑی۔ اس کے خلاف عیسائی نے باطنی صفائی پر اس قدر زور دیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور دنیاوی تعلقات سب ہیچ رہ جاتے ہیں۔ غرض مذاہب نے صداقت کے مختلف پہلوؤں کو خاص نظر سے دیکھا اور باقی پہلو یوں ہی رہ گئے۔ اس مبالغہ سے مذاہب میں انحطاط اور تنزل پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ بات جو باعث انحطاط ہوئی بڑی خوبی کی تھی۔ لیکن اس میں مبالغہ اس قدر کیا کہ وہ خود نوعیت ہوگئی۔ اور دوسری خوبیاں اس مبالغہ کی وجہ سے کمزور ہوگئیں، جس طرح کسی خاص عضو کی ورزش کرنے سے دوسرے اعضاء کمزور ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاق اور روحانی قوتوں کا بھی حال ہے کہ ایک پر زور دینے سے دوسری کمزور ہوجاتی ہیں۔ مذہب کی کامل

صداقت اور اصل کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ سب میں اعتدال قائم رکھے۔

انسان کی دو حالتیں ہین ایک حیوانی دوسری روحانی۔ اور ان دونوں میں آپس مین اختلاف اور عناد ہے۔

پھر روحانی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عقل دوسرے جذبات اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

اخلاق و تمدن کا تنہا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ یہاں دونوں (یعنی عقل و جذبات) گڈ مڈ ہوجاتے ہیں اور اس کی بھی دو صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایک انسان کی ذاتی ضرورتیں دوسرے سوسائٹی کی ضرورتیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں اور باہم ایک دوسرے سے جد و جہد رکھتی ہیں کیونکہ انسان شخصی حیثیت سے حقوق رکھتا ہے اور بحیثیت رکن سوسائٹی اس پر فرائض عائد ہیں۔ بہ حیثیت انسان ناطق کے وہ کامل آزادی چاہتا ہے، سوسائٹی اس آزادی کی مانع ہے۔ شخصی ترقی کے لیے کامل آزادی کی ضرورت ہے لیکن تمدنی ترقی کے لئے حکومت کی ضرروت ہے جو اس قسم کی آزادی کو روکتی ہے اس لئے آزادی اور حکومت میں ہمیشہ جنگ و جدل رہتی ہے۔

غرض انسان اپنے تمام خیالات و تعلقات میں اختلافات سے گھرا ہوا ہے اور یہ اختلافات رفتہ رفتہ عناد و عداوت تک پہنچ جاتے ہیں جو مذہب و تمدن کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں اس لئے انسان اور انسانی تمدن کی بہبودی کے لئے ضرور

ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مختلف زمانوں میں مختلف نبی آئے اور اپنے اپنے عہد میں انہوں نے اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن نقص یہ رہا کہ وہ اصلاح صرف اسی زمانے کے متعلق تھی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مبالغہ مذہب کے لئے سب سے بڑی آفت ہے۔ ایک زمانے میں کسی ایک صداقت یا نیکی میں مبالغہ تھا، نبی نے اسے توڑنا چاہا اور اس کے مقابل میں کسی دوسری صداقت یا نیکی میں مبالغہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کامل اصلاح نہ ہوسکی لیکن یہ ضرور ہوا کہ صداقت کے تمام پہلوؤں کا کامل طور سے اظہار ہو۔ لہذا اس کی کامل اصلاح کے لیے ایک انسان کامل کی ضرورت تھی جو ملک عرب میں مبعوث ہوا۔ اس نے انسان کی مختلف حیثیتوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں پر ایسی غائر نظر ڈالی کہ جو اختلافات اب تک چلے آرہے تھے مٹ گئے۔ اور ایک ایسے مذہب کا سلسلہ قائم ہوگیا جو انسان کی دنیوی اور دینی نجات کا باعث ہوا پیغمبر خدا صلعم ان اختلافات کی لم اور اصلاح کے اصلی راز کو خوب سمجھتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے مبالغہ سے احتراز کیا اور اعتدال کو مدنظر رکھا اور ان اختلافات میں ہمیشہ کے لئے مصالحت پیدا کردی۔ یہ وہ رستہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ پیغمبر خدا نے اس معمے کو حل کیا۔ اور انسان کی کامل بہبودی اور اصلاح کی بنیاد ڈالی جس کا احسان اس عالم پر ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح مبالغہ انحطاط و زوال کی علامت اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اسی طرح اعتدال تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ انسان کی حالت ایسی کشمکش میں ہے کہ وہ مبالغہ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس لئے ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو اعتدال پر رکھے اور اس کی کسی قوت میں زوال نہ آنے پائے۔ اعتدال نہ صرف انسانی معاملات اور دنیا کے امور کی اصلاح کے لئے ضروری ہے بلکہ تمام اخلاق و نیکی اور کل کائنات کا دارو مدار اسی پر ہے۔ یہ زمین یہ سیارے یہ نظامات جو گردش میں ہیں اگر بال برابر اپنے اعتدال سے تجاوز کریں تو ایک عالم میں قیامت برپا ہو جائے اور یہ سارا کارخانہ خاک میں مل جائے۔ یہی حال کائنات کی ہر شے میں ہے۔ نیکی و بدی کیا ہے؟ اخلاق کیا ہے؟ صحت کسے کہتے ہیں؟ ذوق کس چیز کا نام ہے؟ اگر ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کا مدار اعتدال پر ہے۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں قیام اور استحکام کی صورت نہیں۔ اسی عالم گیر اور پر معنی اصول پر پیغمبر اسلام کی تعلیم مبنی ہے۔ اور اسی اصول پر نظر نہ رکھنے سے قدیم مذاہب میں انحطاط و زوال پیدا ہوا۔ اسلام نے اس کمی کو پورا کیا۔ اور اپنی تعلیم سے ہمیشہ کے لئے ایسی بنیاد قائم کردی جس میں انحطاط و زوال نہیں آسکتا۔

اگرچہ رہبانیت کو اسلام نے خارج کیا ہے اور حسن معاشرت کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہدایت

کی ہے کہ بالکل دنیا ہی میں منہمک نہ ہوجاؤ، کیوں کہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی ہے۔ نماز روزے حج کی تاکید کی ہے۔ ظاہری ارکان پر بھی ایک حد تک نظر رکھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا ہے کہ نیکی کے یہ معنی نہیں کہ نماز کے لئے پورب پچھم کو منہ پھیر دیا بلکہ اللہ کی محبت میں عزیز و اقارب، یتیموں، محتاجوں، مسافروں کو اپنا مال دینا۔ غلاموں کو آزاد کرنا۔ زکواۃ دینا۔ نماز پڑھنا۔ اپنے عہد کو پورا کرنا۔ سختی اور تکلیف میں ثابت قدم رہنا۔ اس سے بڑھ کر نیکی کی کیا تعریف ہوسکتی ہے؟ اس کا مدار محض ظاہری ارکان پر ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی سچی محبت اور انسانوں کے ساتھ سچی ہمدردی اور ایثار میں ہے۔ اسلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت، مادی اور روحانی عالم دونوں کی رعایت رکھتا ہے اور جب انسان ظاہری ارکان اور اصول کا پابند ہوگیا تو پھر نیکی کے معنی اس کے لئے وسیع ہوجاتے ہیں۔ اور وہ آگے قدم رکھتا ہے اور اس کا روحانی احساس قوی ہونے لگتا ہے۔ خود آنحضرت صلعم کی زندگی اس کی سچی مثال ہے۔ جناب صحابی رض آنحضرت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سر کے نیچے کملی رکھے ہوئے کعبہ کے سائے میں لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے مشرکوں سے بہت ایذا اور تکلیف پائی تھی۔ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کفار پر بد دعا کیوں نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ اٹھ بیٹھے اور آپ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور فرمانے لگے

کہ اگلے لوگوں میں ایسے بزرگ گزرے ہیں کہ بے دین لوگ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر کھڑا کردیتے تھے اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالتے تھے لیکن اس قدر تکلیف بھی اس بندے کو دین سے نہ پھیرتی تھی اور کسی پر لوہے کی کنگھی اس سختی سے کھینچتے تھے کہ وہ اس کے گوشت کو طے کرکے پٹھے اور ہڈی تک پہنچتی تھی مگر یہ سختی اسے دین سے نہ پھیرتی تھی،، - سچ پر ثابت قدم رہنے کی اس سے بڑھ کر اور کیا تعلیم ہوسکتی ہے!

اسی طرح اسلام نے تمام تعلیم میں اعتدال کو مد نظر رکھا ہے خواہ عبادات میں ہو یا اخلاق میں۔ مثلاً یہ فرمایا ہے کہ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ بدلہ لو تو اس کے بدلہ میں اسی قدر تکلیف دو جتنی تمہیں پہنچی تھی - لیکن اگر صبر کرو، درگزر کرو، معاف کرو اور بخش دو تو اللہ تمہیں دوہرا اجر دیگا اور اللہ ایسے لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور اس کو بار بار مختلف مقامات میں تاکید سے بیان کیا ہے اور بدلے کے مقابلہ میں عفو کا درجہ بہت بڑا بتایا ہے۔ آخر یہاں تک کہدیا ہے کہ تم گنہگاروں، خطا کاروں اور دشمنوں اور مخالفوں سے شیوۂ عفو و غفران اختیار کروگے تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے در گزر کریگا یعنی بدلہ لینا اگرچہ انسان کی عادت میں داخل ہے اور مقتضائے عدالت ہے لیکن اخلاق کریمانہ کا یہی مقتضا ہے کہ برائی کے عوض بھلائی کرو اور مخالفوں کی خطاؤں اور

برائیوں کو معاف کرو اور عموماً در گذر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ بری بات کا جواب ایسا دو جو سب سے بہتر ہو۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نیکی اور بدی برابر نہیں ہوسکتی۔ برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ بہت ہی اچھا ہو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دیکھ لوگے کہ تم میں اور کسی شخص میں عداوت تھی تو اب ایک دم سے گو یا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے اور حسن مدارات کی توفیق انہی لوگوں کو دیجاتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ انہیں کو دی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھایا ہے کہ کسی قسم کی عدوت تم کو عدل کرنے سے باز نہ رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم اپنے دشمن اور دوست سب سے عدل و احسان و انصاف کا کا برتاؤ کرو۔ چنانچہ فرمایا ہے اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے لیے گواہی دینے کو انصاف کی اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑو۔ تقوا کی بات یہی ہے کہ تم عدل کرو۔ اس سے بڑھ کر حسن معاشرت اور نیکی کی اور کیا تعلیم ہوسکتی ہے!

اسی طور پر روپے پیسے کے کمانے اور اس کے صرف میں اعتدال کی ہدایت ہے۔ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو، اللہ مسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔ خرچ کرنے والے فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگدستی کریں۔ ان کا خرچ دونوں کے بین بین ہو۔ رشتہ دار غریب اور مسافر کے

حقوق دیتے رہو۔ اور دولت کو بیجا نہ اڑاؤ۔ دولت کے بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر گزار ہے۔ اگر تم کو پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہے ان سے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے ان کو سمجھا دو۔ اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل اسے پھیلا ہی دو کہ تم تہیدست ہوکر لوگوں کی ملامت سننے بیٹھو۔

پھر اسلام نے ایک دوسری اعلا تعلیم دی ہے جو تمدن کی جان اور ترقی عالم کی روح رواں ہے۔ فرمایا ہے کہ "انما المومنون اخوۃ" یعنی مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ یہ بات صرف اسلام میں پائی جاتی ہے کہ ایک ادنا غلام اور ایک شہنشاہ برابر ہے۔ اور صرف یہ قول ہی قول نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے اب تک اس پر عمل جاری ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے غلام بھی بڑے بڑے شہنشاہ ہو گزرے ہیں۔ اسلام کی حدود میں داخل ہوتے ہی غیر شخص برادری کا بھائی ہوجاتا ہے اور اس کے حقوق سب کے برابر ہوجاتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیم جادو کا اثر رکھتی ہے اور اس نے اشاعت اسلام میں بہت مدد دی ہے۔ دنیا میں جتنی اقوام ہیں ان کی تقسیم محض حدود و جغرافیہ کی رو سے ہے۔ لیکن مسلمان کی قوم اس تنگ اور ادنا امتیاز سے بالا ہے۔ مسلمانوں کی راہ میں ملکی حدود، آب و ہوا، رنگ اور نسل حائل نہیں وہ سب ایک ہیں خواہ کہیں ہوں۔ افریقہ کا حبشی، عرب کا بدو، ہندوستان کا برھمن، یورپ کا فرنگی، مصر کا فلاح غرض

دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی یہ سب کمزور اور عارضی امتیازات اٹھ جاتے ہیں اور وہ ایک ہوجاتے ہیں ۔ مسلمان کہیں ہو اور کوئی ہو مسلمان ہے ۔ اس کا وطن سارا عالم اور اس کی برادری سب مسلمان ہیں ۔ چناں چہ خدا فرماتا ہے کہ سب مل کر مضبوطی سے اللہ کی رسی کو پکڑے رہو اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہو۔ اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کے فضل سے تم بھائی بھائی ہوگئے ۔

اس سے بھی بڑھ کر اعلا اور افضل ایک اور تعلیم اسلام کی ہے جو درحقیقت تمام عالم کے لئے صلائے عام ہے ۔ یعنی پیغمبر نے فرمایا ہے :

من قال لا الہ الا اللہ فدخل الجنہ" ۔ اس سے بڑھ کر کامل وسیع اور عالمگیر اصول کسی دین و مذہب میں نہیں پایا جاتا ۔ اسلام نے اپنا دائرہ اس قدر وسیع کردیا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع ہونا ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کا ہمیشہ بول بالا رہیگا ، اور دنیا پر اس کی حکومت ہوگی ۔ اسلام نے مذہب کی تکمیل کردی اور خدا کی نعمت کو سارے عالم پر پھیلا دیا ۔ اس کا مشرب اس قدر ہمہ گیر اس کے اخلاق اس قدر پاکیزہ اور اس کی تعلیم اس قدر اعتدال پر مبنی اور انسان کی ترقی کی ممد ہے کہ دنیا کی مادی اور روحانی ترقی کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا ۔

یہ محض اقوال نہیں ہیں بلکہ خود پیغمبر اور پاک باطن خلفا اور تابعین نے اپنے عمل سے اخوت اسلامی اور مسالمت اور ایثار کا سچا سبق دیا ہے جس کی شہادت میں تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

خود ڈاکٹر ڈریپر اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ جس طرح مسلمان پولیٹکل حیثیت سے عالم پر چھاگئے، اسی طرح انہوں نے میدان علوم و فنون میں بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ اور نہ صرف یونان کے مردہ علوم کو زندہ کیا بلکہ اپنے علمی انکشافات و ایجادات اور اپنے انوکھے بےبہا خیالات سے دنیا کو مالا مال کردیا۔ اور صلح جوئی، آزادی بے تعصبی اور مسالمت میں سب سے آگے بڑھ گئے اور یورپ کے اندھیرے گھپ میں وہ مشعل دکھائی جس کے نور سے وہ اب تک جگمگ جگمگ کررہا ہے۔ غرض اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مادی اور روحانی ترقی۔ دنیاوی تمدن اور آخروی راحت۔ عقل اور جذبات، مذہب اور سائنس میں توافق اور توازن قائم رکھنے والا ہے۔ اب تک قدیم مذاہب میں سے کسی نے صداقت کے ایک ہی پہلو زور دیا تھا اور کسی نے کسی دوسرے پہلو پر، مگر اسلام نے صداقت اور حقیقت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ان سب کو اس اعتدال اور خوبی کے ساتھ ترتیب دیا کہ اس کی نسبت یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ خاتم المذاہب اور اکمل الادیان ہے اور انسان کی ترقی اور نجات کا سچا اور صحیح راستہ ہے۔ (مقدمات از ص ۵۳ تا ۱۰۶)

———————

کچھ اس کتاب کے بارے میں

"حقیقت یہ ہے کہ مرتب نے بابائے اردو کے نوشتوں کا عطر کھینچ لیا ہے، مطالب
یم و ترتیب ایسی گہری نظر سے عمل میں آئی ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتی، بکھرے
ئے خزانے کو سمیٹ کر اس سلیقے اور ایسی نفاست سے اسے سجایا ہے کہ اس کی سود مندی
چند بڑھ گئی ہے۔ "ڈاکٹر عبدالستار صدیقی"

"یہ کام محنت اور دقت نظر کا تھا۔ جسے مرتب نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔
وم پر آئندہ کام کرنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملے گی اور ان لوگوں کی معلومات میں بھی
نہ ہوگا جو اس کو شوقیہ پڑھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مرحوم زندہ ہوتے تو اسے دیکھ کر
ت خوش ہوتے۔ لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا جو لوگ مرحوم کو محترم جانتے ہیں ان کا
ش ہونا بھی ویسا ہی ہے جیسے مرحوم کا۔۔" "پروفیسر رشید احمد صدیقی"

"۔۔ ایسی کتابیں مرتب کرنا ایک فرد کا کام نہیں بلکہ ایک مجلس کا کام تھا۔ مرحوم
نا پر آج تک جتنی کتابیں یا مضامین یا خاص نمبر نظر سے گزرے ہیں ان میں سے ایک بھی چیز
ں نہ دیکھی جو اتنی جامع پر مغز اور مولانا کی علمی و فکری زندگی کا نچوڑ ہوتی۔۔۔۔ مرتب
نہایت عظیم القدر کام انجام دیا ہے۔۔۔" "مولانا غلام رسول مہر"

"۔۔۔ اس مجموعہ کو شائع کرکے مرتب نے نہ صرف اردو زبان و ادب کی ایک اہم
ت انجام دی ہے بلکہ مولوی صاحب مرحوم کے بے شمار مداحوں اور ان کی تحریروں سے شغف
ھنے والوں کے لئے نہایت گرانقدر مواد فراہم کیا ہے۔۔۔۔" "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی"

"۔۔۔ یہ کتاب ذوق سلیم کے ساتھ ہی ساتھ صحیح فکر و نظر اور حسن انتخاب کا
اچھا نمونہ ہے۔ مجھے سب سے عجیب چیز یہ معلوم ہوئی کہ مرتب نے خود بڑی حد تک
ئے اردو کا اسلوب کامیابی کے ساتھ اپنا لیا ہے۔" "پروفیسر نجیب اشرف ندوی"

"۔۔۔ افکار عبدالحق کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مرتب نے خ
وبہ بنایا۔ مولانا کی تحریروں میں ایک موضوع پر جستہ جستہ جو خیالات بکھرے پڑ
انہیں ترتیب اور سلیقے سے یکجا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مرتب نے ایک عالمانہ اور جام
ہ بھی تحریر فرمایا ہے کوئی برا نہ مانے تو میں کہوں کہ اس مقدمہ کی افادیت متن کتاب
کسی طرح کم نہیں۔۔۔۔ "ڈاکٹر گیان چند"